سوشلزم

اور

فریڈرک اینگلس

مترجمہ

سبطِ حسن

قومی دارالاشاعت بمبئی نمبر ۴

جملہ حقوق محفوظ

قیمت عہ

فریڈرک اینگلس کے حالاتِ زندگی	۵
دیباچہ از اینگلس	۱۷
تمہید از اینگلس	۲۳
پہلا باب	۵۵
دوسرا باب	۷۵
تیسرا باب	۸۸

فریڈرک اینگلس

سوشلزم کا بانی، مزدور تحریک کا رہنما، کارل مارکس کا رفیق کار اور عزیز ترین دوست ——— فریڈرک اینگلس ——— ۲۸ نومبر ۱۸۲۰ء کو جرمنی کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ شہر بارمین (علاقہ رھائن) کا ایک ممتاز سرمایہ دار تھا۔ یہ جگہ اُن دنوں جرمنی کے سب سے زیادہ صنعتی علاقوں میں شمار ہوتی تھی۔ فریڈرک اینگلس نے سرمایہ داری کی اسی فضا میں آنکھیں کھولیں ——— بڑے بڑے کارخانے جن میں مزدوروں سے روزانہ سولہ گھنٹے کام لیا جاتا تھا اور کارخانوں کے ارد گرد تنگ اور تاریک بستیاں جن میں ہزاروں مزدور چوہے اور چھچھوندر کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ اینگلس نے سرمایہ داری نظام کو مٹانے اور اس کی جگہ سوشلسٹ نظام قائم کرنے کے لئے ساری عمر جو جدوجہد کی اس کی داغ بیل بہت ممکن ہے کہ بارمین کے اسی انسانیت سوز ماحول میں پڑی ہو۔

اینگلس کی ابتدائی تعلیم بارمین کے مدرسے میں ہوئی۔ باپ چاہتا تھا کہ بیٹا وکیل بنے لیکن اینگلس کو اُن دنوں وکالت کے بجائے شاعری کی دُھن لگی تھی مگر کارل مارکس کی طرح اینگلس نے بھی جلد ہی یہ محسوس کر لیا کہ وہ اِس میدان کا مرد نہیں ہے۔ شاعری ترک کرنے کے بعد اُس نے جرمن ادب اور فلسفے کا مطالعہ شروع کیا لیکن باپ کو بیٹے کے یہ

مشاغل پسند نہ آئے اور اُس نے اینگلس کو کارخانے داری کا تجربہ حاصل کرنے کے لئے برمین بھیج دیا۔ یہاں اُسے باپ کے حکم کے مطابق ایک پادری کے گھر میں رہنا پڑا۔ ایک دن اُسے پادری کے کتب خانے میں ڈیوڈ اسٹراس کی "حیات مسیح" مل گئی جس میں اسٹراس نے انجیل کے متضاد واقعات پر روشنی ڈالی تھی۔ اس کتاب نے اینگلس کو نہ صرف کلیسا سے بد دل کر دیا بلکہ فلسفے (بالخصوص ہیگل کے فلسفے) کے مطالعے کا شوق بھی بڑھا دیا۔ وہ اپنے دوست کو ایک خط میں لکھتا ہے "میں ہیگل کا معتقد ہونے ہی والا ہوں۔ ایسا ہوگا یا نہیں، یہ تو میں یقین سے نہیں کہہ سکتا البتہ اسٹراس نے مجھے ہیگل کی تعلیم سے آشنا کر دیا ہے اور مجھے یہ تعلیم کافی معقول معلوم ہوتی ہے۔ ہیگل کا فلسفۂ تاریخ تو میری خواہش کے عین مطابق ہے"۔

اکتوبر ۱۸۴۱ء میں اینگلس کو فوجی تعلیم کے لئے برلن جانا پڑا۔ یہاں ہیگل کے مقلدین کی ایک انجمن تھی جس کا نام "ڈاکٹروں کا کلب" تھا۔ اینگلس بھی اس انجمن میں شریک ہو گیا۔ یہ انجمن دراصل اُن سب لوگوں کا مرکزِ ثقل تھی جو جرمنی کی مطلق العنان شہنشاہیت کے خلاف تھے اور ایک بہتر سوسائٹی قائم کرنے کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ یہ لوگ ہیگل کے فلسفے سے کسبِ فیض کرتے تھے جس کا دعویٰ تھا کہ کائنات میں تغیر اور ارتقا کا عمل برابر جاری ہے اور حق و باطل، انصاف اور ظلم کی ابدی جنگ میں بالآخر فتح حق و انصاف کی ہوگی۔ اسی بنا پر ہیگل کے یہ مقلدین یہ دعویٰ کرتے تھے کہ شاہ فریڈرک ولیم کی شہنشاہیت اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جدوجہد کرنا عین حق پسندی اور منشاءِ قدرت کی تعمیل کرنا ہے۔ اس انقلابی طریقۂ کار کے باوجود ہیگل کی تعلیم مادی نہیں بلکہ تصوری تھی۔ ہیگل کہتا تھا کہ خیال، تصور یا دماغ مقدم ہے اور کائنات، انسان اور سماجی تعلقات اسی ابدی تصور کے پرتو

ہیں۔ جیسے جیسے "تصور" بدلتا اور ترقی کرتا ہے اس کے پرتو بھی بدلتے اور ترقی کرتے ہیں۔ اینگلس اور مارکس کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہیگل کی اس انقلابی تعلیم کو جو "سر کے بل کھڑی تھی" الٹ دیا اور ثابت کر دیا کہ کائنات یعنی مادہ مقدم ہے جس نے ترقی کر کے انسان کی شکل اختیار کی اور ہر وہ تصور، ہر وہ خیال جو انسان کے دماغ میں پیدا ہوتا ہے خود ایک مادی فعل کا نتیجہ ہے۔ خیال یا تصور کے لئے دماغ کی ضرورت ہوتی ہے جو مادے کے ارتقاء کے ایک خاص دور میں پیدا ہوا۔ لیکن مارکس اور اینگلس کا یہ نظریہ جسے مادی جدلیت کہتے ہیں بہت بعد میں مرتب ہوا جس وقت کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس وقت تو یہ دونوں ہیگل کے پیرو تھے۔

ارجولائی سنہ ۱۸۴۱ء کو اس جماعت کے ایک ممتاز رکن رُوج نے ڈریسڈن سے ایک اخبار نکالا جس کا مقصد سوشلزم کی تبلیغ کرنا تھا۔ اب اینگلس کو موقع ملا کہ وہ اپنے سوشلسٹ خیالات کو آزادی سے پیش کر سکے چنانچہ اس نے اس اخبار میں لکھنا شروع کیا لیکن "فریڈرک آس ولڈ" کے فرضی نام سے تاکہ گھر والوں کو یہ نہ معلوم ہو کہ اینگلس سوشلسٹ ہو گیا ہے۔ اینگلس کی صحافتی زندگی شہر برمین ہی میں شروع ہو چکی تھی جہاں وہ اخبار "ٹیلی گراف" میں بھی اسی فرضی نام سے لکھا کرتا تھا۔

ستمبر سنہ ۱۸۴۱ء میں اینگلس کی فوجی تعلیم ختم ہو گئی اور وہ مکان واپس آیا لیکن پولیس کے ذریعے باپ کو بیٹے کی سیاسی زندگی کی خبر مل چکی تھی چنانچہ اس خیال سے کہ مبادا جرمنی کی انقلابی فضا میں اینگلس کے خیالات اور بگڑ جائیں اُسے نومبر سنہ ۱۸۴۲ء میں مانچسٹر بھیج دیا گیا جہاں اینگلس کے باپ کا سوتی کارخانہ تھا۔ اینگلس کولون کی راہ سے انگلستان روانہ ہوا۔ کولون میں وہ پہلی بار کارل مارکس سے ملا جو اُن دنوں اخبار رہائنش زیتونگ کا اڈیٹر تھا لیکن یہ

ملاقات بڑی روا داری میں ہوئی پھر بھی اینگلس نے وعدہ کیا کہ وہ مارکس کے اخبار میں برابر لکھا کرے گا چنانچہ انگلستان پہونچ کر اُس نے اپنے مضامین کی پہلی قسط ۳۰ر نومبر کو بھیج دی۔ یہ مضمون انگلستان کی چارٹسٹ تحریک کے بارے میں تھا۔

اینگلس ۲۱ مہینے انگلستان میں رہا۔ اینگلس کے لئے انگلستان کا یہ قیام وہی حیثیت رکھتا ہے جو مارکس کے لئے پیرس کا قیام۔ دونوں جرمن فلسفے کے طالب علم تھے اور آگے چل کر دونوں اسی نتیجے پر پہونچے کہ سرمایہ داری کی جگہ کمیونزم کا ہونا لازمی ہے جس میں انسان انسان کا غلام نہ ہوگا اور نہ کوئی کسی دوسرے کی محنت کا پھل کھائے گا۔ دونوں نے بتایا کہ سرمایہ داری کو مٹانے اور کمیونسٹ سوسائٹی قائم کرنے کا تاریخی فرض مزدور طبقہ انجام دے گا جو اپنی اس انقلابی جدوجہد میں دوسرے تمام مظلوم اور جفاکش لوگوں کی رہنمائی کرے گا۔ لیکن اس بات کا شعور کارل مارکس کو انقلاب فرانس کے ذریعے ہوا اور اینگلس کو برطانوی سرمایہ داری کے مطالعے کے ذریعے۔ اینگلس کو مزدور طبقے کا تجربہ اس سے پہلے بریمن میں بھی ہو چکا تھا چنانچہ اُس نے وہاں کے مزدوروں کے حالات اخبار ٹیلی گراف میں چھپوائے تھے لیکن اُس وقت تک خاکہ بہت دھندلا تھا اور مزدوروں کے حالات کا گہرا مطالعہ کرنے کا پورا موقع نہ ملا تھا۔ مانچسٹر میں نسبتاً زیادہ آزادی تھی چنانچہ اُس نے کارخانے کے دفتر میں مکھی مارنے کے بجائے مزدوروں سے ربط ضبط بڑھایا، ان کی بستیوں میں چکر لگایا، ان کی بپتا اپنی آنکھوں سے دیکھی اور اُس وقت تک مزدوروں کے بارے میں جتنی سرکاری رپورٹیں چھپ چکی تھیں سب پڑھ ڈالیں۔ اس تجربے اور مطالعے کا نتیجہ اُن مضامین کی شکل میں ظاہر ہوا جو اینگلس نے جرمن اخبار میں لکھے۔

ان مضامین میں انگلستان کے سرمایہ داری نظام کی خرابیوں کا خاکہ کھینچا، سرمایہ داروں کی ذاتی ملکیت، اور مزدوروں کی اجتماعی پیداوار کا تضاد، مقابلہ اور مسابقت کی وجہ سے پیداوار میں تاراج،

معاشی بحران، اُجرت کا قانون غرض اینگلس نے برطانوی سرمایہ داری کے تمام پہلوؤں پر تنقیدی نظر ڈالی۔

اینگلس کی سب سے پہلی تصنیف "انگلستان کے مزدوروں کے حالات" ہے۔ اس کتاب کے بارے میں لینن لکھتا ہے کہ "مزدور طبقے کی بپتا کی اتنی سچی تصویر نہ تو اس سے پہلے کسی نے کھینچی تھی اور نہ اس کے بعد"۔ مانا کہ اینگلس سے پہلے بہتوں نے انگلستان کے مزدور طبقے کی تکلیفوں پر آنسو بہائے تھے اور مزدوروں کو ان تکلیفوں سے نجات دلانے کی خواہش بھی ظاہر کی تھی لیکن اینگلس ہی وہ پہلا سوشلسٹ تھا جس نے مزدور طبقے کی تکلیفوں اور مصیبتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتایا کہ یہ طبقہ جن شرمناک حالات میں زندگی گزار رہا ہے وہ خود اُسے مجبور کر رہے ہیں کہ وہ اپنی آزادی اور نجات کے لئے جد و جہد کرے۔ اینگلس نے یہ بھی بتایا کہ سرمایہ دار طبقہ مزدور طبقہ پر ترس کھا کر اس کا منہ موتیوں سے نہیں بھرے گا بلکہ مزدور طبقہ خود اپنی جماعتی کوشش کے بل پر آزاد ہوگا۔ مزدور طبقے کی سیاسی تحریک مزدوروں میں یہ شعور پیدا کرے گی کہ سوشلزم کے سوا نجات کا کوئی اور رستہ نہیں۔

مانچسٹر میں رہ کر اینگلس نے چارٹسٹ کی مزدور تحریک میں بھی حصہ لیا اور مشہور سوشلسٹ لیڈر رابرٹ اوون سے ربط ضبط پیدا کیا اور سوشلسٹ اخباروں بالخصوص رابرٹ اوون کے اخباروں میں متعدد مضامین بھی لکھے۔

اگست ۱۸۴۴ء میں اینگلس جرمنی جاتے ہوئے پیرس میں آیا اور مارکس سے ملا اور دونوں انقلابی مفکر جو طبقاتی جد و جہد، تاریخ کے مادی نظریے اور مزدور طبقے کے تاریخی فرائض کے بارے میں ایک ہی نتیجے پر پہونچ چکے تھے کئی دن تک تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ یہیں مارکس اور اینگلس کی دوستی کی بنیاد پڑی۔ ایسی دوستی جو مرتے دم تک قائم رہی اور جس کی مثال دنیا

شکل ہی سے پیش کر سکتی ہے۔ پیرس سے اینگلس اپنے وطن بارمن گیا لیکن گھر کے حالات اتنے ناساز گار تھے کہ وہ زیادہ دن تک وہاں نہ رہ سکا اور مارکس کے پاس برسلز چلا آیا۔ ۱۸۴۵ء اور ۱۸۴۷ء کے درمیان اینگلس کا زیادہ وقت مارکس کے ساتھ برسلز اور پیرس میں گزرا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مزدوروں کی تحریک دھیرے دھیرے زور پکڑ رہی تھی اور جرمنی اور فرانس اور برطانیہ میں سوشلزم کا چرچا بڑھ رہا تھا۔ اسی کے ساتھ اُن لال بجھکڑوں کی تعداد بھی بڑھ رہی تھی جن کے خیالی منصوبوں سے سوشلزم کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ وائی ٹلنگ، پرودھان، گرون غرض وہ جنونی شیخ چلی تھے جو دنیا کی حالت سدھارنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے تھے لیکن زندگی کی حقیقتوں سے بے خبر ہو کر۔ اینگلس نے بتایا کہ سوشلزم کی ناؤ ذاتی خواہشات اور جذبات کے بل پر پار نہیں لگائی جا سکتی بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی جانچ کی جائے اور معلوم کیا جائے کہ وہ کون سی قوت ہے، وہ کون سا طبقہ ہے جو سرمایہ داری کو ڈھا کر سوشلزم کی عمارت کھڑی کر سکتا ہے۔

انھیں دنوں پیرس میں ایک خفیہ انجمن "جرمن کمیونسٹ لیگ" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس انجمن کا مقصد پیرس میں مقیم جرمن مزدوروں کو منظم کرنا تھا۔ یہاں بھی خیالی سوشلسٹوں کی بھرمار تھی جو "محبت" اور "خدمت خلق" اور "غریبوں کی بھلائی" کے خیال سے "ایک بہتر سوسائٹی" بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اکتوبر ۱۸۴۶ء میں انجمن کے اغراض و مقاصد طے کرنے کے لئے ممبروں کا ایک جلسہ ہوا جس میں اینگلس نے ان خیالی سوشلسٹوں کی خوب خبر لی۔ اس نے کہا کہ اگر ہم لوگ اپنے آپ کو کمیونسٹ کہتے ہیں تو پھر ہمیں سب سے پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ کمیونزم ہے کیا بلا۔ میں نے کمیونسٹوں کا مقصد یہ قرار دیا (۱) سرمایہ داروں کے مقابلے میں مزدور طبقے کے مفاد کی حمایت کرنا (۲) ذاتی ملکیت کو منسوخ کر کے پنچایتی ملکیت قائم کرنا (۳)

(۳) ان مقاصد کے لئے جمہوری انقلاب" (مارکس کے نام خط مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۸۴۶ء) اس جلسے میں اینگلس کی جیت ہوئی۔ خیالی سوشلسٹوں کو تیرہ ووٹ کے مقابلے میں صرف دو ووٹ ملے۔ دھیرے دھیرے اس انجمن کا اثر بڑھنے لگا اور ۱۸۴۷ء کو کمیونسٹ لیگ کی پہلی کانگرس لندن میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں اینگلس بھی شریک ہوا پہلے لیگ کا نعرہ تھا "سب انسان بھائی بھائی ہیں" اینگلس نے کہا کہ دنیا کی تاریخ طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے اور آج بھی سرمایہ دار طبقہ اور مزدور طبقہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں نہ کہ بھائی بھائی اور چونکہ دنیا کی آئندہ ترقی کا دارومدار مزدور طبقے کے اتحاد اور عمل پر ہے لہذا ہمارا نعرہ ہونا چاہیے "دنیا کے مزدورو ایک ہو جاؤ"۔ کانگرس نے اینگلس کی یہ تجویز مان لی۔ اس کانگرس میں یہ بھی طے پایا کہ کمیونسٹ لیگ کے سیاسی عقائد اور سوشلزم کے بنیادی اصول ایک اعلان نامے کی شکل میں تیار کئے جائیں۔ یہ کام بھی اینگلس اور مارکس کے سپرد ہوا۔ اعلان نامے کا مسودہ اینگلس نے تیار کیا اور پھر دونوں دوستوں نے اس پر نظر ثانی کی۔ یہی وہ اعلان نامہ ہے جو کمیونسٹ مینی فسٹو کے نام سے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ یہ مارکس اور اینگلس کی پہلی تصنیف ہے جس میں کمیونزم، طبقاتی جدوجہد، مزدور طبقے کا آغاز، سرمایہ دار طبقہ اور مزدور طبقے کے تضاد کا ارتقاء، معاشی ابتری، اس کے نتائج، مزدور طبقے کے تاریخی فرائض اور کمیونسٹوں کے اغراض و مقاصد سے بحث کی گئی ہے۔

ابھی کمیونسٹ لیگ کی تحریک اپنی ابتدائی منزل میں تھی کہ فرانس میں دوسرا انقلاب آیا جو رفتہ رفتہ سارے یورپ میں پھیل گیا۔ جرمنی کی انقلابی تحریک کی رہنمائی مارکس اور اینگلس کے سپرد تھی جو ان دنوں کولون میں مقیم تھے۔ جرمن حکومت اس تحریک کو کچلنے پر تلی ہوئی تھی چنانچہ وہاں مزدوروں کے خلاف فوجی طاقت بھی استعمال کرنے لگی۔ مزدوروں کو

کبھی اپنے بچاؤ کی تدبیریں کرنی پڑیں۔ مزدوروں کے مسلح دستے بننے لگے اور شاہی فوج کی مسلح قوت کا جواب مسلح قوت سے دیا جانے لگا۔ جنوبی جرمنی میں تو اس جدوجہد نے باقاعدہ خانہ جنگی کی شکل اختیار کر لی۔ اینگلس بھی مزدوروں کی اس فوج میں ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوا اور چار لڑائیوں میں شریک ہوا۔ اُس وقت سے اینگلس کو فن جنگ سے ایسی دلچسپی ہوئی کہ اُس کے دوست اُس کی فوجی لیاقت اور صحیح پیشین گوئیوں کے باعث اُسے بعض اوقات "جنرل اینگلس" کہہ کر پکارا کرتے۔

اس خانہ جنگی میں مزدوروں کو شکست ہوئی، کارل مارکس کا اخبار بند ہوا اور مارکس اور اینگلس دونوں کو جلاوطن ہو کر لندن جانا پڑا۔ لندن میں تھوڑے دن تک مارکس کے ساتھ رہنے کے بعد اینگلس مانچسٹر چلا گیا جہاں اُسے دوبارہ اپنے باپ کے کارخانے میں نوکری کرنی پڑی تاکہ مارکس کی مدد کر سکے جو لندن میں اپنی بیوی بچوں سمیت مقیم تھا۔ اس دُوری کے باوجود شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو جب اینگلس اور مارکس ایک دوسرے کو خط نہ لکھتے ہوں۔ ان خطوں میں نجی باتیں کم ہوتیں البتہ فلسفے اور معاشیات کی گتھیاں سُلجھائی جاتیں، سائنس کے انکشافات سے بحث کی جاتی، نئی کتابوں پر تبصرے ہوتے، تصنیف و تالیف میں ایک دوسرے کو مشورے دیے جاتے غرض شاید ہی کوئی مسئلہ ہو جو دونوں دوست ایک دوسرے کی رائے کے بغیر طے کرتے ہوں۔

ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ اینگلس کو مسائل جنگ سے بڑی دلچسپی تھی چنانچہ ۱۸۷۰ء میں جب جرمن شہنشاہیت نے فرانس کو شکست دی اور فرانسیسی قوم پر ظلم توڑنے لگی تو اینگلس نے لکھا تھا کہ جب کبھی کوئی قوم صرف اس وجہ سے اطاعت قبول کر لیتی ہے کہ اُس کی فوج غنیم کا مقابلہ نہ کر سکی تو ایسی قوم کو بزدل کہتے ہیں لیکن اگر کوئی قوم پوری مستعدی سے —

— خواہ وہ غیر منظم طریقے پر ہی کیوں نہ ہو — مقابلہ کرتی رہے تو حملہ آور کو جلد معلوم ہو جاتا ہے کہ خون اور آگ کا یہ پرانا کھیل زیادہ دن تک نہیں کھیلا جا سکتا۔ انگریزوں نے امریکہ میں، فرانسیسیوں نے اسپین میں نپولین کے عہد میں، آسٹریا نے ۱۸۴۸ء میں اٹلی اور ہنگری کے عوامی مقابلے کی صداقت کو مجبوراً تسلیم کیا۔

ہر شخص یہ ماننے پر مجبور ہے کہ سوویت یونین میں ہٹلر کو جو شکست ہوئی اس کی ذمہ دار وہاں کی سوشلسٹ سوسائٹی ہی ہے۔ مارکس اور اینگلس کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن سرمایہ داری نظام کی جگہ سوشلسٹ نظام بن کر رہے گا۔ روس کی بالشویک پارٹی نے لینن اور اسٹالین کی رہبری میں یہ تاریخی فرض انجام دیا اور دنیا کے ایک چھٹے حصے میں سوشلسٹ نظام کو پروان چڑھایا۔ یہی وہ سوشلسٹ نظام ہے جس نے جرمن فاشزم کو شکست دی۔ یہی وہ سوشلسٹ نظام ہے جس کی فوجیں آج دنیا کو امن اور جمہوریت کا پیام دے رہی ہیں اور جس کی کامرانیوں نے یورپ کے محکوم ملکوں میں جنگِ آزادی کی ایک لہر دوڑا دی ہے۔

۱۸۷۰ء میں اینگلس نے نوکری چھوڑ دی اور لندن آ کر تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گیا۔ اسی زمانے میں مارکس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "سرمایہ" لکھی اور اینگلس نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں "قاطع دُوہرنگ" اور "خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست" سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ "قاطع دُوہرنگ" پروفیسر دُوہرنگ کی کتاب کا جواب ہے جس کی تیاری میں اینگلس نے چھ سال صرف کئے اور فلسفہ، تاریخ، سائنس، علم ہندسہ، علم نباتات، علم الاجسام غرض شاید ہی کوئی علم ایسا ہو جس کا بغور مطالعہ نہ کیا ہو۔ یہ کتاب اینگلس کا شاہکار ہے جس میں سوشلزم کے تمام بنیادی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ "خاندان،

ذاتی ملکیت اور ریاست" میں اینگلس نے ان تینوں معاشرتی اداروں کے تاریخی ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے اور ثابت کیا ہے کہ انسان کے دولت پیدا کرنے کا طریقہ بدلتا ہے تو یہ معاشرتی ادارے بھی بدل جاتے ہیں۔

۱۸۸۳ء میں کارل مارکس کا انتقال ہو گیا۔ اب اینگلس کی ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں۔ ذاتی تصنیف و تالیف، کارل مارکس کے نامکمل مسودات کی تکمیل اور بین الاقوامی مزدور تحریک کی رہنمائی۔ مزدور تحریک پہلے کے مقابلے میں اب بہت بڑھ گئی تھی اور ہر ملک کے مزدور کارکن مارکس کے بعد اینگلس ہی سے مدد لینا چاہتے تھے۔ جرمنی، اسپین، رومانیہ، روس، فرانس، غرض یورپ کا شاید ہی کوئی ملک ہو جہاں کے سوشلسٹ کارکن مزدور تحریک کے سلسلے میں اینگلس سے مشورہ نہ لیتے ہوں۔ کارل مارکس "سرمایہ" کی صرف پہلی جلد شائع کر سکا تھا، بقیہ دونوں جلدوں کے خاکے اور مسودے یوں ہی پڑے تھے چنانچہ اینگلس نے یہ کام اپنے ذمہ لیا اور ۱۸۸۵ء میں "سرمایہ" کی دوسری جلد اور ۱۸۹۴ء میں تیسری جلد شائع کی۔ آسٹریا کے سوشلسٹ لیڈر ایڈلر کے بقول اینگلس نے "یہ دونوں جلدیں تیار کر کے اپنے دوست کی اتنی شاندار یادگار قائم کر دی جس پر اینگلس کے علم کے بغیر خود اس کا نام بھی کندہ ہو گا۔" یہ دونوں جلدیں دراصل مارکس اور اینگلس کی مشترکہ تصنیف ہیں لیکن اینگلس، اتنا منکسر مزاج واقع ہوا تھا کہ "سرمایہ" کیا، وہ کمیونسٹ مینی فسٹو کو بھی اپنی تصنیفوں میں شمار نہ کرتا تھا۔ اس کے انکسار کا یہ عالم تھا کہ جب مشہور سوشلسٹ اہل قلم مہرنگ نے اپنے ایک مضمون میں کارل مارکس اور فریڈرک اینگلس دونوں کو سوشلزم کا بانی قرار دیا تو اس نے مہرنگ کو شکایت کا خط لکھا کہ "یہ سچ ہے کہ میں اور مارکس، سوشلزم کے بنیادی مسائل کے بارے میں الگ الگ ایک ہی نتیجے پر پہنچے لیکن مارکس مجھ سے بڑا

متفکر تھا اور اگر میں نے یہ اصول نہ بھی مرتب کئے ہوتے تو مارکس انھیں خود ہی مرتب کر لیتا۔ جہاں تک مارکس کا تعلق ہے میں ہمیشہ اُس کے نقشِ قدم ہی پر چلا ہوں۔"

اینگلس مارکس کو بے حد عزیز رکھتا تھا اور اُس کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار رہتا تھا۔ چنانچہ اس دوستی کے بارے میں لینن لکھتا ہے کہ "قدیم دیومالا میں دوستی کی بعض حیرت انگیز مثالیں ملتی ہیں لیکن یورپ کے مزدور فخر کر سکتے ہیں کہ اُن کا انقلابی فلسفہ دو ایسے عالموں اور مجاہدوں نے ترتیب دیا جن کے تعلقات دوستی کی اِن قدیم مثالوں کو بھی شرماتے ہیں۔"

اینگلس کی زندگی کے باقی ماندہ دن مارکس کے مسودات کو مرتب کرنے اور اپنی اور مارکس کی تصانیف پر دیباچہ لکھنے میں صرف ہوئے۔ وہ اس کام میں اتنا محو ہوا کہ "قدرت میں جدلیت" کے عنوان سے جو کتاب لکھنا چاہتا تھا اُس کی تکمیل نہ کر سکا۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۵ء میں روس سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں اینگلس سائنس کی مدد سے یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ "قدرت کی لاتعداد تبدیلیاں بھی جدلیت کے قانونِ حرکت کے اُسی طرح ماتحت ہیں جس طرح تاریخ کے واقعات۔"

۵ اگست ۱۸۹۵ء کو اینگلس کا انتقال ہو گیا اور دنیا اُس مفکرِ اعظم سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی جس نے پچاس سال تک سوشلزم کے بنیادی اُصول مرتب کئے، انقلابی سوشلزم کو خیالی سوشلزم کی خس و خاشاک سے پاک کیا اور مزدور طبقے کو بتایا کہ اُس کی اور دوسرے محنت پیشہ طبقوں کی نجات سوشلزم ہی میں ہے لہٰذا اُنھیں اپنے اس انقلابی مقصد اور تاریخی فرض کی انجام دہی کے لئے متحد اور منظم ہونا چاہئے۔

مارکس کی طرح اینگلس کی معلومات بھی بہت وسیع تھیں چنانچہ اس نے فلسفہ،

تاریخ، معاشیات، عمرانیات، سائنس، فن جنگ غرض انسانی علم کے ہر پہلو پر گہری نظر ڈالی اور اپنے خیالات ظاہر کئے۔ ایسے خیالات جو آج تک دنیا کے محنت پیشہ طبقوں کے لئے شمع ہدایت کا کام دیتے ہیں۔ اور آج شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جہاں کے عوام کی انقلابی تحریک سوشلزم کے بانیوں کی انقلابی تعلیم سے محروم ہو اور شاید ہی کوئی ایسی زبان ہو جس میں اُن کی بیش قیمت تصانیف کے ترجمے نہ ہو چکے ہوں۔

سبط حسن

بمبئی۔ مئی ۱۹۴۴ء

تصحیح صفحہ ۷ پر پال لافارگ (۱۸۴۲ء تا ۱۹۱۱ء) کو غلطی سے جرمنی کا باشندہ کہا گیا ہے۔ وہ دراصل فرانسیسی تھا۔ اُس نے پہلی کمیونسٹ انٹرنیشنل قائم کرنے میں مارکس اور اینگلس کی بڑی مدد کی۔ وہ فرانسیسی لیبر پارٹی کے بانیوں میں سے تھا۔

دیباچہ

یہ کتاب میری ایک دوسری تصنیف "سائنس میں ہرڈوہرنگ کا انقلاب"[1] (مطبوعہ لیپزگ ۱۸۷۸ء) کے تین ابواب پر مبنی ہے۔ میرے دوست پال لفارگ[2] ان ابواب کا فرانسیسی میں ترجمہ کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے میں نے انہیں ایک جگہ مرتب کیا اور کہیں کہیں دو ایک باتوں کا اضافہ بھی کر دیا۔ فرانسیسی ترجمے کی نظرثانی میں نے خود کی جس کے بعد وہ پہلے تو "سوشلسٹ ریویو" میں اور پھر الگ کتابی صورت میں "خیالی سوشلزم اور علمی سوشلزم" کے نام سے ۱۸۸۰ء میں پیرس میں شائع ہوا۔ فرانسیسی سے ایک ترجمہ پولستانی زبان میں بھی ابھی جنیوا سے شائع ہوا ہے۔

فرانسیسی بولنے والے ملکوں اور سب سے بڑھ کر خود فرانس میں لفارگ کے ترجمے کو حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔ یہ دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ اگر جرمن زبان میں بھی یہ تینوں ابواب الگ چھاپے جائیں تو اچھا ہو۔ اسی زمانے میں زورک سے "سوشل ڈیموکریٹ" اخبار کے اڈیٹروں نے مجھے لکھا کہ جرمن سوشل ڈیموکریٹک پارٹی میں لوگ نئے تبلیغی رسالے اور کتابیں چھاپنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اڈیٹروں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا اس مقصد کے لئے میں انہیں یہ تینوں باب چھاپنے کی اجازت دے سکتا ہوں۔ ظاہر ہے مجھے ان کی تجویز سے پورا اتفاق تھا اور اس مقصد کے لئے میں نے اپنی کتاب ان کے حوالے کر دی۔

لیکن اصل میں یہ کتاب عام لوگوں میں تبلیغ کی غرض سے نہیں لکھی گئی تھی۔ جو کتاب خاص سائنسی

---

[1] یہ کتاب عام طور سے "قاطع ڈوہرنگ" کے نام سے مشہور ہے۔

[2] فرانس جرمنی کا کمیونسٹ لیڈر اور کارل مارکس کا داماد۔

نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہو اس سے پر معرف کیسے لیا جا سکتا تھا؟ نفسِ مضمون اور پیرایۂ بیان میں اس کے لئے کن تبدیلیوں کی ضرورت تھی؟

جہاں تک پیرایۂ بیان کا تعلق ہے صرف چند الفاظ غیر زبانوں کے ایسے تھے جن سے سمجھنے میں دشواری پیدا ہو سکتی تھی۔ لیکن خود لسال[۳] کی تقریروں اور تبلیغی تحریروں میں غیر زبانوں کے الفاظ کم نہیں ہوتے تھے اور میرے جانتے کبھی کسی نے اس کی شکایت نہیں کی۔ اور اب تو ہمارے مزدور پہلے سے کہیں زیادہ اور بڑی باقاعدگی سے اخبار پڑھنے لگے ہیں اس لئے اب وہ غیر زبانوں کے الفاظ سے زیادہ مانوس ہو چکے ہیں۔ میں نے صرف یہ کیا ہے کہ دوسری زبانوں کے غیر ضروری الفاظ نکال دیے ہیں۔ اور جن الفاظ کے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا انہیں رہنے دیا ہے۔ لیکن ان کا ترجمہ کر کے تشریح کرنے کی کوشش میں نے جان بوجھ کر نہیں کی۔ دوسری زبانوں کے کچھ الفاظ ایسے ہیں جن کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ انہیں عام طور پر علم و فن کی اصطلاح مان لیا گیا ہے۔ اور اگر ان کا ترجمہ ہو سکتا تو لوگ ان الفاظ کو من و عن قبول ہی کیوں کرتے؟ ان الفاظ کے ترجمے سے مطلب بگڑ جاتا ہے۔ بات صاف ہونے کے بجائے اور الجھ جاتی ہے۔ زبانی سمجھا دینا اس سے کہیں بہتر ہے۔

نفسِ مضمون کے سمجھنے میں میرا دعویٰ ہے کہ جرمن مزدوروں کو کوئی دقّت نہیں ہو گی بحیثیت مجموعی صرف تیسرا حصہ کچھ مشکل ہے مگر مزدوروں سے زیادہ "پڑھے لکھے" سرمایہ پرستوں کے لئے۔ کیونکہ اس کا تو تعلق ہی مزدوروں کے عام حالاتِ زندگی سے ہے۔ مطلب سمجھانے کے لئے میں نے یہاں کہیں کہیں

۳ؔ فرڈیننڈ لسال (۱۸۲۵ء تا ۱۸۶۴ء) جرمنی کی مزدور تحریک میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۸۶۳ء کے لگ بھگ جب سارے جرمنی کے مزدوروں میں ہلچل شروع ہوئی تو لسال نے جنرل ایسوسی ایشن آف جرمن ورکرز کے نام سے جرمنی کے مزدوروں کی سب سے پہلی عوامی سیاسی جماعت قائم کی جو سرمایہ پرست جمہوری پارٹیوں کے اثر سے آزاد تھی۔ تاریخی اعتبار سے یہی لسال کی اہمیت ہے۔ عام مزدوروں میں اپنے خیالات کی تبلیغ کرنے کا لسال کو خاص ملکہ تھا۔ ایک عرصے تک وہ مارکس اور اینگلس کے خیالات سے خوشہ چینی کرتا رہا اور ایک زمانہ تھا جب لسال بڑے فخر سے اپنے کو مارکس کا "شاگرد" کہا کرتا تھا۔ لیکن وہ مزدور انقلاب کے کٹھن راستے پر قائم نہ رہ سکا اور جرمنی کے سوشلسٹ دشمن وزیر اعظم بسمارک سے جا ملا۔

کچھ باتیں بڑھا دی ہیں۔ لیکن ایسا کرتے وقت میرے ذہن میں مزدوروں سے زیادہ "پڑھے لکھے" لوگوں کا خیال تھا جن کا نمونہ فان آئزن، (ممبر پارلیمنٹ) اور ہنریک فان سیبل وغیرہ ہیں۔ ان لوگوں کے دل میں رہ رہ کر ایک شدید قسم کا ہیجان اُٹھا کرتا ہے کہ اپنی قابل نفرت جہالت کا کچا چٹھا لوگوں کے سامنے کھول کر پیش کریں اور اسی کے ساتھ سوشلزم کے بارے میں اپنی نافہمی کا پردہ فاش کریں۔ ان کی اس نافہمی کا سبب اب کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔

"ڈان کوئی ہوت" اگر پن چکیوں پر نیزے کا وار کرتا ہے تو اپنا فرض بجا لاتا ہے۔ اس کی فطرت کا تقاضا یہی ہے۔ لیکن سان پینزا کے لئے ایسا کرنا ہرگز روا نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگ یہ دیکھ کر بھی حیران ہوں گے کہ سوشلزم کے ارتقا کی تاریخ میں کانٹ[۴] اور لاپلاس کے نظریۂ آفرینش، جدید علوم طبعی اور ڈارون[۶]

۴۔ "ڈان کوئی ہوت" سولہویں صدی کے مشہور ہسپانوی ادیب سروانتیس کے ناول کا ہیرو اور ایک مضحکہ خیز کردار ہے۔ ڈان کوئی ہوت کی آڑ میں مصنف نے قرونِ وسطیٰ کے مہم جو بانکوں اور سن چلے سرداروں کا مذاق اُڑایا ہے۔ یہ کتاب حقیقت میں یورپ کے سارے جاگیری سماج پر ایک زبردست طنز ہے۔ سان کو پینزا ایک متوسط طبقے کا آدمی، اور ڈان کوئی ہوت کا مصاحب ہے جس کی ہوشمندی کے مقابلے میں اس کے آقا کی بدعنوانیاں اور بھی نمایاں ہو جاتی ہیں۔

۵۔ دیکھو صفحہ ۳۳

۶۔ چارلس ڈارون (۱۸۰۹ء تا ۱۸۸۲ء) انگلستان کا مشہور سائنس داں۔ جس کے نظریۂ ارتقائی علم الاجسام میں انقلاب کر دیا۔ اُس نے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کیا کہ نامیاتی اجسام بدلتے رہتے ہیں، اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق ڈھالتے رہتے ہیں اور جن اجسام میں اس کی صلاحیت نہیں ہوتی وہ فنا ہو جاتے ہیں۔ تنازع البقا اور بقاء اصلح کو اس نے بہت صاف طریقے پر سمجھایا ہے۔ مارکس نے ڈارون کی کتاب "جنس کی ابتدا" پڑھنے کے بعد اینگلس کو لکھا تھا کہ اس شخص کی تحقیقات سے ہمارے نظریۂ جدلیت کی تائید ہوتی ہے۔ مارکسزم میں ڈارون کی جو پوزیشن ہے اس کا اندازہ اس تقریر سے ہوتا ہے جو اینگلس نے مارکس کے جنازے پر کی تھی "جس طرح ڈارون نے نامیاتی اجسام میں (باقی صفحہ ۳۰ پر)

اور کلاسیکی جرمن فلسفہ اور ہیگل[ش] سبھوں کا ذکر موجود ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ علمی سوشلزم اصلیت میں جرمنی کی پیداوار ہے اور اس کا ظہور صرف اُسی قوم میں ہو سکتا تھا جس کے مسلم الثبوت فلسفیوں نے شعوری جدلیات کی روایات کو زندہ رکھا ہو۔ یعنی جرمنی میں[ش]۔ تاریخ کا مادی نظریہ[۹] اور خاص کر مزدوروں اور سرمایہ داروں کی جدید طبقاتی کشمکش پر اس نظریہ کا اطلاق جدلیات[۱۰] کے بغیر ناممکن تھا۔ لیکن جرمن سرمایہ داروں

بسلسلہ صفحہ (۱۹) ارتقا کے قانون کا پتہ لگایا اُسی طرح مارکس نے انسانی تاریخ میں ارتقا کے قانون کا پتہ لگایا۔"

شه - ہیگل (۱۷۷۰ء تا ۱۸۳۱ء) جرمنی کا مشہور فلسفی۔ خارجی تصوریت کا مبلغ۔ قانون جدلیت کو انسانی تاریخ پر سب سے پہلے ہیگل ہی نے منطبق کیا گو تصوریت کے اُصول کے مطابق۔ "ہیگل کی جدلیت تصوف کی چادر اُوڑھے ہوئے ہے اس کے باوجود ہیگل پہلا شخص ہے جس نے جدلیت کے فعل کو جامع طریقے پر بیان کیا ہے۔" (مارکس) "ہیگل کا دعویٰ ہے کہ قدرت اور تاریخ میں جو جدلیاتی ارتقا نظر آتا ہے وہ تصور کی از خود حرکت کا ایک حقیر خاکہ ہے۔" (اینگلس)

شه - "جرمنی میں" قلم کی چوک ہے۔ اصل میں ہونا چاہئے "جرمن قوم کے لوگوں میں"۔ سائنسی سوشلزم کے ظہور کے لئے اگر ایک طرف جرمن جدلیات کی ضرورت تھی تو دوسری طرف برطانیہ اور فرانس کے ترقی یافتہ معاشی اور سماجی حالات بھی اسی قدر ضروری تھے۔ اُنیسویں صدی کے چوتھے دہے کی ابتدا میں جرمنی معاشی اور سیاسی ارتقا کی جن منزلوں سے گزر رہا تھا وہ آج سے بھی کہیں زیادہ پس ماندہ تھے۔ ان حالات میں وہاں سوشلزم نہیں صرف سوشلزم کا سوانگ رچا جا سکتا تھا۔ اس کی تشریح کمیونسٹ مینی فسٹو کے تیسرے حصے یعنی جرمن "یا سچی" سوشلزم کے باب میں کی جا چکی ہے۔ کوئی معقول نتیجہ حاصل کرنے کے لئے برطانیہ اور فرانس کے حالات پر جرمن جدلیاتی تنقید کو چسپاں کرنا ضروری تھا۔ لہٰذا اس اعتبار سے، سائنسی سوشلزم خالص جرمنی کی نہیں بلکہ ایک بین الاقوامی پیداوار ہے۔ (نوٹ از اینگلس)

۹ اور ۱۰ - جدلیت ایک یونانی اصطلاح ہے۔ یونانی زبان میں اس لفظ کے معنی مباحثہ یا مناظرے کے ہیں۔ قدیم یونانی فلسفیوں کا دستور تھا کہ وہ حقائق کی جستجو مباحثوں کے ذریعے کرتے۔ ایک فریق دوسرے فریق کی دلیلوں کا تضاد ظاہر کرتا اور اس طرح وہ آخر میں کسی نتیجے پر پہونچتے۔ یونان کے بعض فلسفیوں (باقی صفحہ ۲۱ پر)

کے قائم کئے ہوئے مدرسوں کے اساتذہ جرمنی کے باعظمت فلسفیوں اور ان کی جدلیات کو بھلا بیٹھے ہیں اور اس کے بدلے انھوں نے فلسفے کے طرح طرح کے بے معنی معجون مرکب تیار کئے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کی

(بسلسلہ صفحہ ۱۹) مثلاً زینو اور ہرک لائٹس نے کہا کہ مظاہر قدرت بھی اپنے داخلی تضاد ہی کی بنا پر ہردم حرکت کرتے، بدلتے اور ارتقا کے مدارج طے کرتے ہیں۔ جدید سائنس نے قدیم یونانیوں کے اس اُصول کار کی تائید کی یہی وجہ ہے کہ مارکس اور انیگلس نے بھی اپنے تمام نظریوں کی بنیاد اسی قانون حرکت پر رکھی۔ انیگلس نے لکھا کہ "قدرت جدلیات کی کسوٹی ہے..... تمام کائنات —— ریت کے چھوٹے سے ذرے سے لے کر سورج تک، ہر چھوٹی بڑی چیز —— ہر وقت حرکت کرتی رہتی ہے، بدلتی رہتی ہے، عالم وجود میں آتی اور فنا ہوتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدلیت اشیا اور اُن کے مدرکات کو، اُن کی حرکت میں، اُن کے بقا اور فنا کے دوران میں اُن کے باہمی رشتے میں دیکھتی ہے۔" ارتقا کے اس استمراری فعل کی بنیاد وہ داخلی تضاد ہے جو ہر شے میں پایا جاتا ہے۔ لینن نے کہا کہ "ارتقا نام ہے متضاد قوتوں کی جدوجہد کا —— اور جدلیت سے مُراد وہ تضاد ہے جو ہر شے کے اندر کارفرما رہتا ہے۔"

جدلی مادیت سوشلزم کا بنیادی اُصول ہے۔ اسے جدلی مادیت اس لئے کہتے ہیں کہ مظاہر قدرت کے مطالعے اور تحقیق کا جو طریقہ سوشلزم اختیار کرتی ہے وہ جدلیاتی ہوتا ہے اور مظاہر قدرت کا جو تصور سوشلزم قائم کرتی ہے، اُن کی جو تشریح سوشلزم کرتی ہے اور اُس سے جو نظریئے وہ مرتب کرتی ہے وہ مادی ہوتے ہیں۔

تاریخی مادیت نام ہے جدلی مادیت کے اُصولوں کو سماجی زندگی پر منطبق کرنے کا۔ انسانی سوسائٹی کی تاریخ، اور اُس کے ارتقا کو جدلی مادیت کی عینک سے دیکھنے کا۔ یعنی سماج کے قوانین حرکت کا نام تاریخی مادیت ہے۔ سماج کے قوانین حرکت کی بنیاد کیا ہے۔ وہ کیا تضاد ہے جو سماج کی رگ وپے میں کارفرما ہے۔ کارل مارکس اور انیگلس نے کہا کہ وہ تضاد سماج کی طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے۔ اس طبقاتی جدوجہد کی بنیاد، ذرائع زندگی حاصل کرنے کا وہ طریقہ ہے جو کسی خاص عہد میں انسانی سوسائٹی اختیار کرتی ہے۔ اور ذرائع زندگی حاصل کرنے کے طریقے کے بدلتے ہی نہ صرف (باقی صفحہ ۲۲ پر)

دجہ سے مجبور ہو کر ہمیں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ حقیقت میں جدلیات ابھی تک محفوظ اور قائم ہے جدید طبعی سائنس کا سہارا لینا پڑا ۔ ہم جرمن سوشلسٹوں کو اس بات پر فخر ہے کہ ہم صرف سنٹ سائمون، فورئیر اور اوین[۱۱] کے ہی وارث نہیں۔ بلکہ کانٹ، نیشنے[۱۲] اور ہیگل کا ترکہ بھی ہمیں ملا ہے۔

فریڈرک اینگلس

لندن ۔ ۲۱؍ ستمبر ۱۸۸۲ء

(بسلسلہ صفحہ ۲۱) طبقاتی جدوجہد کی نوعیت بدل جاتی ہے بلکہ سماج کا پورا ڈھانچہ، انسان کی معاشرت، اس کی تہذیب، اس کے خیالات اور عادات سب بدل جاتے ہیں۔

۱۱ ۔ دیکھو صفحہ

۱۲ ۔ نیشنے ۔ (۱۸۶۲ء تا ۱۸۱۶ء) جرمن فلسفی۔

تمہید

یہ چھوٹی سی کتاب ایک بڑی کتاب کا جزو ہے۔ ۱۸۵۶ء کے قریب ڈاکٹر ڈوہرنگ نے جو برلن یونیورسٹی میں پروفیسر تھے دفعتاً اور بڑے طمطراق سے اپنے سوشلسٹ ہونے کا اعلان کیا اور جرمن عوام کے سامنے نہ صرف ایک مبسوط سوشلسٹ نظریہ پیش کیا بلکہ سماج کی دوبارہ تنظیم کے لئے ایک مکمل عملی خاکہ بھی مرتب کر دیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے پیش روؤں پر کیچڑ اچھالنے لگے۔ مارکس پر آپ کی خاص نظر عنایت رہی اور اُس کے خلاف آپ نے خوب خوب زہر اگلا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب جرمنی کی سوشلسٹ پارٹی کے دونوں فرقے یعنی آئزناخر[۱۲] اور لسالین ابھی ابھی آپس میں ملے تھے اور اس طرح نہ صرف اُن کی قوت میں زبردست اضافہ ہوا تھا بلکہ مشترکہ دشمن کے خلاف اس قوت کو کام میں لانے کی صلاحیت بھی بڑھ گئی تھی۔ سوشلسٹ

---

[۱۲] جرمنی میں سوشلسٹ پارٹی کے دو گروہ الگ الگ دو پارٹیوں کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ایک تو آئزناخرجس کا اصلی نام جرمن اشتراکی جمہوری مزدور پارٹی تھا۔ یہ پارٹی مارکس اور انگلس کے اصولوں پر عمل کرتی تھی۔ دوسرے گروہ یعنی انجمن مزدوران کا رہنما معتدل اور قوم پرست اشتراکی لسال تھا۔ دونوں گروہوں میں ۱۸۷۵ء میں گوتھا کانفرنس میں اتحاد ہو گیا اور ایک متحدہ دستور العمل اس کانفرنس میں مرتب ہوا جو گوتھا پروگرام کے نام سے مشہور ہے۔ اس پروگرام پر لسال کے اصولوں کا اثر غالب تھا اور مارکس نے اپنی پُرزور تنقید سے اس کی دھجیاں بکھیر دیں۔ آج مارکس کی تنقید اپنی نظری اہمیت کی وجہ سے اصل پروگرام سے زیادہ مشہور ہے اور گوتھا پروگرام کا نام بھی صرف "گوتھا پروگرام کی تنقید" کی وجہ سے باقی رہ گیا ہے۔

پارٹی جرمنی میں بہت تیزی سے ترقی کر رہی تھی۔ لیکن اسے ایک طاقت بنانے کی پہلی شرط یہ تھی کہ اس نئے اتحاد کو خطرات سے بچایا جائے۔ ڈاکٹر ڈوہرنگ نے علانیہ اپنے گرد ایک ایسا جتھا بنانا شروع کیا جو آگے چل کر ایک علیحدہ جماعت کی بنیاد ہو سکے۔ ایسی حالت میں اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی سے قطع نظر ہمیں یہ چیلنج منظور کر کے مقابلے کے تیار ہو جانا پڑا۔

یہ لڑائی مشکل نہ سہی لیکن پیچیدہ اور لمبی ضرور تھی۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں ہم جرمن ہر چیز پر گہری نظر ڈالتے ہیں اور "عمیق" "جدت پسندی" یا "جدید" "عمق نظر" سے کام لیتے ہیں۔ جب کبھی ہم میں سے کوئی اپنے خیال میں کوئی نیا نظریہ تیار کرتا ہے تو سب سے پہلے اُسے اس نئے نظریہ کی وضاحت ایک جامع نظام کی شکل میں کرنا پڑتی ہے۔ اُس بیچارے کو یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ منطق کے ابتدائی اُصول اور کائنات کے بنیادی قوانین ازل سے صرف اسی لئے موجود تھے کہ اس نئے نظریے کے لئے راستہ صاف کریں۔ اور ڈاکٹر ڈوہرنگ بھی اسی قومی خصوصیت کے مارے ہوئے تھے۔ چنانچہ موصوف نے اپنا نظریہ تین ضخیم جلدوں میں پیش کیا ہے۔ پہلی جلد میں ذہنی، اخلاقی، طبعی اور تاریخی "فلسفہ کا ایک مکمل نظام" ۔۔۔ دوسری جلد میں "معاشیات اور سوشلزم کا ایک مکمل نظام" ۔۔۔ اور تیسری جلد میں "معاشیات کی تنقیدی تاریخ" بیان کی ہے۔ ان جلدوں میں تمام پچھلے فلسفیوں اور معاشیات کے عالموں اور خاص کر کارل مارکس پر مخالفت کی بوچھار ہوئی ہے

غرضکہ سچ پوچھئے تو سائنس میں ایک مکمل انقلاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔۔۔ مجھے ان سب کا جواب دینا پڑا۔ مجھے تمام اور ہر ممکن موضوع پر قلم اٹھانا پڑا۔ مادہ اور حرکت کی ابدیت سے لے کر اخلاقی تصورات کی فنا ہو جانے والی نوعیت اور ڈارون کے انتخاب طبعی سے لے کر مستقبل کے سماج میں بچوں کی تعلیم و تربیت تک ہر سوال سے بحث کرنی پڑی۔ بہر حال میرے مد مقابل کی ہمہ گیری اور اس کی نظم و ترتیب کی بدولت مجھے موقع مل گیا کہ میں ان کے مقابلے میں، ان بے شمار اور قسم قسم کے مسائل پر اپنے اور مارکس کے خیالات کو زیادہ مربوط صورت میں پیش کردوں؛

جس کی کوشش ابھی تک نہیں کی گئی تھی۔

میرا جواب سب سے پہلے سوشلسٹ پارٹی کے اخبار "ورورٹس" میں سلسل مضامین کی شکل میں اور پھر سائنس میں "ڈوہرنگ کا انقلاب" یا قاطع ڈوہرنگ کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اپنے دوست پال لفارج کی خواہش پر اس کتاب کے تین باب میں نے علیحدہ پمفلٹ کی صورت میں مرتب کر دئے جس کو انھوں نے (فرانسیسی میں) ترجمہ کر کے ۱۸۸۰ء میں شائع کیا۔ فرانسیسی سے اس کا پولستانی اور ہسپانوی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ اور ۱۸۸۳ء میں ہمارے جرمن دوستوں نے بھی اس پمفلٹ کو اصل جرمن زبان میں شائع کیا۔ اس کے بعد اطالوی، روسی، ڈینی، ولندیزی اور رومانی زبانوں میں بھی جرمن زبان سے اس کے ترجمے شائع ہوئے ہیں۔ اس انگریزی اشاعت کے ساتھ اس کے ترجموں کی تعداد دس تک پہونچ جائے گی۔ میرے خیال میں ابھی تک کوئی اشتراکی تصنیف حتی کہ ۱۸۴۸ء کا کمیونسٹ مینی فسٹو اور مارکس کی کتاب "سرمایہ" بھی اتنی زبانوں میں شائع نہیں ہوئی۔ جرمنی میں اس کے چار اڈیشن نکل چکے ہیں اور کل ملا کر بیس ہزار جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔

اس کتاب میں معاشیات کی جتنی اصطلاحیں استعمال ہوئی ہیں وہ کارل مارکس کی کتاب "سرمایہ" سے ماخوذ ہیں۔ "جنس تبادلہ کی پیداوار" کے دور سے مراد وہ معاشی دور ہے جس میں چیزیں صرف پیدا کرنے والوں کے استعمال ہی کے لئے نہیں پیدا کی جاتیں بلکہ اُن میں تبادلے کی غرض بھی شامل ہوتی ہے۔ یعنی چیزیں اس لئے نہیں پیدا کی جاتیں کہ اُن کی قدر استعمال پر مبنی ہے بلکہ اس لئے پیدا کی جاتی ہیں کہ وہ بازار میں بکیں۔ یہ دور "پیداوار بغرض تبادلہ" کے آغاز سے اب تک قائم ہے۔ اس دور کو صرف سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار ہی میں عروج حاصل ہوتا ہے۔ یعنی اُن صورتوں میں جب کہ سرمایہ دار یعنی ذرائع پیداوار کے مالک، مزدوروں یعنی اُن لوگوں سے اُجرت پر کام لیتے ہیں جن کے پاس اپنی ذاتی محنت کی قوت کے علاوہ دولت پیدا کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہوتا اور پیداوار کی لاگت اور بازاری قیمت میں جو فرق ہوتا ہے اُسے جیب میں رکھ لیتے ہیں۔

قرونِ وسطیٰ کے بعد صنعتی پیداوار کی تاریخ کے تین دَور ہیں۔

(۱) دستکاری جس میں استاد کاریگر چند شاگردوں اور اُجرت پر کام کرنے والے دوسرے کاریگروں کے ساتھ کام کرتے ہیں اور ہر آدمی الگ الگ پورا سامان تیار کرتا ہے۔

(۲) کارخانہ داری، جس میں کاریگروں کی نسبتاً بڑی تعداد ایک کارخانہ میں اکٹھا ہو کر پورا سامان تقسیم محنت کے اصول پر تیار کرتی ہے۔ ہر سامان بنتے وقت درجہ بدرجہ ہر کاریگر کے ہاتھ سے گذرتا ہے۔

(۳) جدید صنعتی دَور، جس میں سامان بھاپ یا بجلی کے ذریعے چلنے والی مشینوں سے تیار ہوتا ہے اور مزدور کا کام صرف یہ رہ جاتا ہے کہ کل پُرزوں کی حرکت کی دیکھ بھال اور ان کے کام کی اصلاح کرتا رہے۔

میں خوب جانتا ہوں کہ برطانوی پبلک کے ایک بڑے حصہ کو اس کتاب پر اعتراض ہوگا لیکن اگر ہم تہ اعظم (یورپ) کے رہنے والوں نے برطانوی "شریف زادوں" کے تعصبات کا پاس کیا ہوتا تو ہماری حالت اور بھی پست ہوتی۔ اس کتاب میں "تاریخی مادیت" کو سراہا گیا ہے۔ درآنحالیکہ انگریزی پڑھنے والوں کی بہت بڑی اکثریت "مادیت"[۱۳] کے نام سے کانوں پر ہاتھ

۱۳؎ عام طور سے لوگ سمجھتے ہیں کہ مادیت کا فلسفہ "کھاؤ، پیو، مزے کرو" کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن یہ باتیں سماج اور مذہب کے اجارہ داروں نے مادیت کو بدنام کرنے کی غرض سے پھیلا رکھی ہیں۔ واقعہ اس کے بالکل برخلاف ہے۔ مادیت اور تصوریت فلسفے کے دو اور ایک دوسرے کے بالکل مخالف مسلک ہیں۔ تصوریت جس پر تمام دنیا کے مذاہب کی بنیاد ہے، ہمارے ذہن، حواس اور تصورے باہر کائنات یا عالم مادی کے وجود کو تسلیم نہیں کرتی۔ برخلاف اس کے مادیت، کائنات اور عالم مادی کو حقیقی چیز مانتی ہے جس کا ہمارے ذہن سے باہر اپنا خارجی وجود ہے۔ فلسفہ مادیت کی نظر میں مادہ مقدم ہے کیونکہ وہ حواس، تصور اور ذہن کا سرچشمہ اور مخرج ہے۔ اور ذہن مادہ کا ایک عکس، ہستی کا ایک پرتو ہے۔ خیال اس مادہ کی پیداوار ہے جو ہزاروں سال کی نشوونما کے بعد درجہ کمال کو پہنچ چکا ہے یعنی انسانی دماغ۔ (باقی صفحہ ۴۷ پر)

دھرتی ہے۔" لاادریت[۱۴] "تو برداشت کی جا سکتی ہے لیکن مادیت قطعی قابل قبول نہیں۔

سترھویں صدی کے بعد سے ہر قسم کی جدید مادیت کا پہلا گھر انگلستان ہی ہے۔ مادیت برطانیہ کی قدرتی پیداوار ہے۔

"انگلستان کے ایک متکلم[۱۵] ودلس اسکوٹس نے سوال کیا تھا کہ کیا مادہ سوچ نہیں سکتا۔ مادہ میں سوچنے کی قوت پیدا کرنے کے لئے اُس نے خدا کو قادر مطلق مانا اور اُسی کے پیچھے پناہ لی۔ یعنی اُس نے دینیات کی زبان سے مادیت کی تعلیم دی۔ اس کے علاوہ ودلس اسکوٹس اسمیت پسند[۱۶] تھا۔

(بسلسلہ صفحہ ۲۶) خیال دماغ کی پیداوار ہے۔ اس سلسلے میں لینن نے لکھا ہے کہ مادہ وہ شے ہے جس کے عمل کو ہمارے حواس محسوس کرتے ہیں۔ مادہ خارجی حقیقت ہے جو ہمیں احساس میں ودیعت ہوئی ہے۔ مادہ، کائنات ایتھی، عالم طبعی، مقدم ہے اور روح، شعور، احساس، عالم نفس اس سے دوسرے درجے پر ہے۔"

۱۴ لاادریت کے لفظی معنی ہیں کسی بات کا علم نہ ہونا۔ یہ فلسفے کا وہ مسلک ہے جس کے ماننے والے کہتے ہیں کہ ہمارے حواس سچ مچ کسی خارجی حقیقت کا عکس پیش کرتے ہیں یا نہیں اس کا ہمیں کوئی علم نہیں؛ یعنی وہ مادیت کو مکمل کھلا تسلیم کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن سرمایہ پرست علما کی نظر میں 'لاادریت بھی مادیت کا در پردہ اقرار ہی ہے۔

۱۵ متکلم۔ قرون وسطیٰ میں یونانی درسیات کے معلم اسی نام سے یاد کئے جاتے تھے یہ لوگ عالم دین ہوا کرتے اور عام طور سے ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ مذہب کے اصولوں کو منطق کے مطابق پیش کیا جائے۔

۱۶ اسمیت پسندی، اسم (بمعنی نام) سے ماخوذ ہے۔ قرون وسطیٰ میں فلسفے کا یہ ایک مسلک تھا جس کے ماننے والے کہتے تھے کہ تصورات محض اشیا کے نام ہیں ورنہ خیال اور تصور کا اپنا کوئی آزاد وجود نہیں۔

اسمیت پسندی جو مادیت کی پہلی شکل ہے خاص طور سے انگریز (انگلستان) میں پائی جاتی ہے۔

انگریزی مادیت کا بادا آدم بیکن[17] ہے۔ اس کی نظر میں طبیعی فلسفہ ہی اصل فلسفہ ہے اور طبیعیات جس کا انحصار حواس کے تجربے پر ہے طبیعی فلسفہ کا سب سے اہم جز ہے۔ وہ بسا اوقات انکسا غورث[18] اور دیمو قراطیس[19] کے ذرات کو بطور سند پیش کرتا ہے۔ اس کے خیال میں حواس غلطی نہیں کر سکتے۔ وہ تمام علم کا منبع ہیں۔ سائنس کی بنیاد تجربوں پر ہے، اور حواس سے جو تجربے حاصل ہوتے ہیں، سائنس ان کی عقلی طریقہ پر چھان بین کرتی ہے۔ استقرا[20]، تجزیہ، مقابلہ، مشاہدہ اور تجربہ اس عقلی طریقہ کار کی خاص شکلیں ہیں۔ مادے کی فطری خصوصیات میں "حرکت" سب سے اول اور مقدم ہے — حرکت نہ صرف میکانکی اور ریاضیاتی شکل میں بلکہ خاص طور سے ہیجان جوہر حیات اور تناؤ کی شکل میں۔

بیکن کی مادیت میں مختلف قسم کی ترقیوں کے جراثیم چھپے ہوئے تھے۔ اس کا مادہ ایک طرف

---

[17] بیکن (سنہ ۱۵۶۱ء سے سنہ ۱۶۲۶ء) برطانیہ کا مادیت پسند فلسفی اور ادیب

[18] انکسا غورث۔ قدیم یونان کا فلسفی۔ سنہ ۵۰۰ ق۔م میں پیدا ہوا۔ اپنی ساری جائداد رشتہ داروں میں تقسیم کر کے بیس سال کی عمر میں ایتھنز چلا گیا تاکہ علم حاصل کرے۔

[19] دیمو قراطیس۔ قدیم یونان کا مادیت پسند فلسفی۔ سنہ ۴۶۰ ق۔م تا سنہ ۳۶۱ ق۔م۔ اس کا نظریہ تھا "جو ہے وہ فنا نہیں ہو سکتا۔ تغیر سوائے اجزا کے اتحاد اور انتشار کے کچھ بھی نہیں۔ ہر معلول کی علت اور غایت ہوتی ہے۔ کائنات میں صرف ذرات اور خلا کا وجود پایا جاتا ہے اس کے علاوہ جو ہے وہ خیالات ہیں۔ ذرات کی تعداد شمار میں نہیں آسکتی اور اس کی ہیئت اور شکلیں بھی لاتعداد ہیں۔ یہ نظریہ ذرات کا بانی دیمو قراطیس ہی ہے۔

[20] استقرا منطق کا وہ طریقہ استدلال ہے جس میں جزئی مشاہدات سے کُلّی نتیجے اخذ کئے جاتے ہیں۔ برعکس اس کے استخراج وہ طریقہ ہے جس میں ایک مفروضہ کلیہ سے جزئی نتیجے نکالے جاتے ہیں۔ متاخرین میں بیکن پہلا فلسفی تھا جس نے استقرائی طریقے کو نئے سرے سے رواج دیا۔

حواسی اور شاعرانہ چمک دمک سے گھرا ہوا ہے اور اپنی مسکراہٹ سے دلوں کو لبھاتا ہے۔ دوسری طرف اُس۔ کے بلیغ اور پُر حکمت نظریے میں وہ متضاد باتیں پائی جاتی ہیں جو دینیات سے آئی ہیں۔

" آگے بڑھ کر مادیت نے صرف ایک ہی سمت میں ترقی کی۔ بیکن کی مادیت کو سب سے پہلے ہابس[21] نے مرتب کیا۔ لیکن ہابس ایک ریاضی داں تھا۔ اس لئے اس کی ترتیب میں ریاضیاتی انداز پیدا ہو گیا اور حواس سے حاصل کئے ہوئے علم نے اپنی شاعرانہ دلکشی کھو دی۔ اس کی نوعیت ریاضی داں کے کسی نہ محسوس ہونے والے تجربے کی سی ہو گئی۔ علم ہندسہ تمام علوم کا سرتاج قرار پایا۔ مادیت نے مردم بیزاری کا روپ بھر لیا اور اُس کے لئے ضروری ہو گیا کہ اپنی حریف یعنی مردم بیزار اور غیر مجسم روحانیت پر خود اُسی کے ہتیار سے غلبہ پانے کی غرض سے اپنا چولا بدل دے اور دنیا تج دے۔ چنانچہ مادیت حواسی حقیقت سے گزر کر ایک ذہنی حقیقت ہو گئی۔ لیکن ذہن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نتیجے سے بے پرواہ ہو کر تضاد سے استقامت کی طرف جاتا ہے۔

" ہابس نے بیکن کے مادی نظریے کو برقرار رکھا۔ اُس کے دلائل یہ ہیں۔ اگر انسان کے تمام علم کا منبع حواس ہی ہیں تو پھر ہمارے ادراک اور تصور، خارجی اشیا کی ایسی پرچھائیوں کے سوا کچھ نہیں جن کے حواسی جامے اُتار لئے گئے ہوں۔ فلسفہ صرف اِن پرچھائیوں کے نام رکھ سکتا ہے۔ ایک ہی نام کا اطلاق کئی پرچھائیوں پر ہو سکتا ہے۔ پھر ان ناموں کے بھی نام ہو سکتے ہیں۔ اگر ایک طرف ہم یہ کہیں کہ تمام تصورات کا منبع ہیں؟ اور دوسری طرف یہ کہ ایک کلمہ، کلمہ سے زیادہ ہے تو اس میں تضاد پایا جائے گا۔ یعنی اُن موجودات کے علاوہ جن کو ہم اپنے حواس کے ذریعے جانتے ہیں اور جو الگ الگ انفرادی طور پر موجود ہیں، ایسے موجودات بھی ہیں جن کی نوعیت انفرادی نہیں بلکہ عمومی ہے۔ ایک "غیر مجسم شے" ایسا ہی مہمل دعویٰ ہے جیسا "غیر مجسم جسم"۔ جسم ہستی یا ہیولیٰ ایک

---

[21] ہابس۔ (۱۵۸۸ء - ۱۶۷۹ء) انگلستان کا مادیت پسند فلسفی اور ریاضی داں۔ مطلق فرماں روائی کا حامی: "ریاستوں کو تعمیر کرنا اور اُنھیں قائم رکھنا ایک فن ہے جس کے قاعدے ویسے ہی ہیں جیسے ریاضی اور ہندسے کے"

ہی حقیقت کے مختلف نام ہیں۔ خیال کو مادہ سے الگ سوچنا ہی جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مادہ دنیا کے تمام تغیرات کا منبع ہے۔ لفظ "لامتناہی" بے معنی ہے اگر اس سے یہ مفہوم نہیں پیدا ہوتا کہ اضافہ کرتے رہنے کے لامتناہی عمل کی صلاحیت ہمارے ذہن میں پائی جاتی ہے۔ ہمیں صرف مادی چیزوں کا شعور ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ہم خدا کے وجود کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتے۔ صرف ہمارا اپنا وجود یقینی ہے۔ ہر انسانی جذبہ ایک میکانکی حرکت ہے جس کی ایک ابتدا ہے اور ایک انتہا۔ تہیج کے مدرکات کو ہی ہم "خیر" کہتے ہیں۔ انسان اور نیچر ایک ہی قوانین کے تابع ہیں۔ اختیار اور آزادی فضول الفاظ ہیں۔

"ہابس نے بیکن کے فلسفہ کو مرتب تو کیا لیکن اُس نے بیکن کے اس بنیادی دعویٰ کا کوئی ثبوت نہ دیا کہ علم کا منبع حواس ہیں۔ یہ کمی لاک نے پوری کی اور اپنی کتاب 'انسانی ادراک پر ایک مقالہ' میں اس دعویٰ کو ثابت کیا۔ ہابس نے بیکن کی مادیت کے الٰہیاتی تعصبات کی دھجیاں اڑا دیں اور کولنس، ڈاڈول، کوورڈ، ہارٹلے اور پریسٹلے نے لاک کے فلسفہ محسوسیات[۳۳] کے بچے کھچے دینیاتی عنصر کو بھی ختم کر دیا۔ بہر حال عملی مادئین کے لئے خداپرستی[۳۴] مذہب سے چھٹکارا پانے کا آسان راستہ ہے۔" (مارکس اور اینگلز کی کتاب "مقدس خاندان" صفحہ ۲۰۴ تا ۲۰۷)

یہ بتاتے ہوئے کہ جدید مادیت برطانیہ کی پیداوار ہے کارل مارکس نے ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اگر آج انگریز کارل مارکس کی اس ستائش پر خوش نہیں تو بڑے افسوس کی بات ہے۔ اس سے

---

[۳۳] فلسفہ محسوسیات یعنی وہ نظریہ کہ علم انسانی محض حواس ظاہری کے تاثرات یا محسوسات سے بنا ہے۔

[۳۴] یہاں خداپرستی سے مراد وہ عقیدہ ہے جس میں خدا کا اقرار تو ہو مگر وحی کا اقرار لازم نہ ہو۔ ہر مذہب خدا کی وحی پر مبنی ہونے کا مدعی ہے۔ اگر وحی کو تسلیم نہ کیا جائے تو مذہب کی جڑ ہی کٹ جائے گی اور پھر اس سے چھٹکارا پانا مشکل نہ ہوگا۔

انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بیکن، ہابس اور لاک فرانسیسی مادیین کی اس زبردست جماعت کے بانی مبانی ہیں جس نے اُن تمام بڑی اور بحری لڑائیوں کے باوجود جن میں جرمنوں اور انگریزوں نے فرانسیسیوں پر فتح پائی، اٹھارویں صدی کو فرانسیسی صدی بنا دیا، اور یہ اُس شاندار انقلابِ فرانس سے بھی پہلے کی بات ہے جس کے اثرات و نتائج قبول کرنے کی کوشش میں انگریز اور جرمن اب تک لگے ہوئے ہیں۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اُنیسویں صدی کے وسط میں ہر اُس مہذب پردیسی کو جو انگلستان میں بسنے آتا، جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی وہ انگلستان کے سفید پوش متوسط طبقہ کی تنگ نظری اور حماقت تھی۔ اس زمانہ میں ہم لوگ مادہ پرست یا کم از کم بہت ترقی یافتہ آزاد خیال تھے، اور یہ بات ہماری سمجھ میں نہ آتی تھی کہ اُس زمانے میں بھی انگلستان کے تقریباً سارے پڑھے لکھے لوگ قسم قسم کے ناممکن عجزوں پر ایمان رکھتے تھے اور بکلینڈ اور منٹل جیسے طبقات الارض کے ماہرین بھی اپنی سائنس کے حقایق کو اس لئے توڑ مروڑ کر بیان کرتے کہ کتاب پیدائش (انجیل) کی فرضی کہانیوں سے زیادہ ٹکر نہ ہونے پائے۔ اور ایسے لوگوں کی تلاش میں جو مذہبی مسائل کے بارے میں خود اپنی ذہنی صلاحیتوں کو کام میں لانے کی جرأت کرتے، آپ کو غیر تعلیم یافتہ اور "گنوار" مزدوروں خاص کر اُن لوگوں میں جانا پڑتا جو رابرٹ اوین کے ماننے والے تھے۔

لیکن انگلستان اب "مہذب" ہو گیا ہے۔ ۱۸۵۱ء کی نمائش نے انگلستان کی جزیرائی خلوت پسندی کا خاتمہ کر دیا۔ انگلستان کے کھانے پینے، رہن سہن اور خیالات میں دھیرے دھیرے آنا بین الاقوامی انداز پیدا ہو گیا کہ اب تو یہ جی چاہتا ہے کہ کاش بعض برطانوی رسموں اور طور طریقوں نے یورپ میں بھی اتنا ہی رواج پایا ہوتا جتنا یورپ کے رسم و رواج اور طور طریقوں نے برطانیہ میں پایا ہے۔ لیکن اگر ایک طرف انگلستان میں اعلیٰ قسم کے روغن زیتون کا استعمال عام ہوا (جو ۱۸۵۱ء سے پہلے صرف رئیس زادوں میں محدود تھا) تو اس کے ساتھ یورپ کے ایک مہلک مرض نے بھی زور پکڑا اور وہ تھا مذہبی اُمور میں تشکک کا فلسفہ۔ لاادریت کا فلسفہ اگرچہ ابھی تک برطانوی کلیسا کے مقابلے میں برابری کا مرتبہ نہیں حاصل کر سکا ہے لیکن برطانیہ کے دوسرے مذہبی اداروں پر

بعثت ضرور ہے گیا ہے۔ ان حالات میں بہت سے لوگوں کو، جو اس بڑھتی ہوئی بے دینی پر صدق دل سے لعنت ملامت کیا کرتے ہیں، یہ جان کر شاید کچھ تسلی ہو کہ یہ نئے اور بعض کیلئے خیالات باہر سے نہیں آئے۔ روزمرہ کے استعمال کی اور چیزوں کی طرح وہ جرمنی کے بنے ہوئے نہیں بلکہ انگلستان کی خاص دیسی اور قدیم پیداوار ہیں۔ اور دو سو برس پہلے ان خیالات کی بنیاد رکھنے والے انگریز اتنا آگے بڑھے ہوئے تھے جہاں آج ان کے خلاف قدم رکھتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔

اور سچ پوچھئے تو یہ فلسفہ "لاادریت" جو لنکا شائر والوں کی زبان میں ذلیل کہا جاتا ہے مادیت کے سوا اور ہے کیا؟ لاادریوں کی نظر میں فطرت کا تصور سراسر مادی ہے۔ ساری کائنات ایک ایسے قانون کے تابع ہے جس میں کسی خارجی مداخلت کی گنجائش نہیں۔ لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو کائنات ہمیں معلوم ہے اس کی حدود کے پرے کسی حاکم مطلق کے وجود کی تصدیق یا تردید کرنے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ اٹھارویں صدی میں تو یہ بات شاید تسلیم کرلی جاتی لیکن آج جب کہ کائنات کا ارتقائی مفہوم عام ہے کسی خالق یا فرماں روا کے لئے کوئی گنجائش نہیں اور کسی ایسے حاکم مطلق کا ذکر کرنا جو عالم وجود سے الگ ہو خود اپنے بیان کی تردید اور میری رائے میں مذہبی لوگوں کے جذبات کی ناحق توہین کرنا ہے۔

تشکیکین یہ مانتے ہیں کہ ہمارے تمام علم کا انحصار انہیں معلومات پر ہے جو حواس کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ کیوں کر معلوم ہو کہ ہمارے حواس مدرکات کا صحیح عکس پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی سلسلے میں وہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ مدرکات یا اُن کے خواص سے اُن کی مراد اصل مدرکات اور خواص نہیں ہیں جن کا انہیں کوئی یقینی علم نہیں بلکہ ان کے وہ نقوش ہیں جو حواس پر مرتسم ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس طریقہ استدلال کو صرف دلائل سے رد کرنا مشکل نظر آتا ہے لیکن عمل استدلال سے قدیم ہے اور قبل اس کے کہ انسان کی ذہنی اُپج یہ دشواری پیدا کرتی، انسانی عمل نے اسے حل کر دیا۔ حلوے کا ثبوت اس کے کھانے میں ہے۔ مدرکات میں ہمیں جو خاصیتیں نظر آتی ہیں ان کے مطابق جب ہم انہیں استعمال

کرنے لگتے ہیں تو گویا حاصل کئے ہوئے نقوش کو ایک ایسی کسوٹی پر کستے ہیں جو کبھی غلطی نہیں کرتی۔ اگر ہمارا ادراک غلط ہے تو ہم یہ طے کرنے میں بھی غلطی کریں گے کہ مدرکات کو کیسے استعمال کیا جائے اور ہماری ساری کوشش ناکام رہے گی۔ لیکن اگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائیں اور معلوم کریں کہ مدرک اور ہمارے ادراک میں مطابقت ہے اور مدرک وہی مقصد پورا کرتا ہے جو ہم چاہتے تھے تو یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ مدرک خارجی حقیقت ہے اور اُس کے خواص کا ادراک خارجی حقیقت کے مطابق ہے۔ اور اگر کبھی ہمیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اس کے اسباب بھی عام طور سے جلد ہی معلوم ہوجاتے ہیں۔ ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ جس ادراک کی بنا پر ہم نے عمل کیا تھا وہ یا تو نامکمل اور سطحی تھا یا دوسرے ادراکات کے اثر کے مل جانے سے مبہم ہوگیا تھا۔ اسی کو ہم ناقص استدلال کہتے ہیں۔ اگر ہم اپنے حواس کو تعلیم دیں اور انھیں معقول طریقہ سے استعمال کریں اور اپنے افعال کو صحیح ادراک کے مقررہ حدود میں رکھیں تو ہمارے افعال کے نتائج یہ ثابت کردیں گے کہ مدرکات کی خارجی نوعیت اور ہمارے ادراک میں مطابقت پائی جاتی ہے۔ اب تک ایک مثال بھی ایسی نہیں ملی جس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ حواس سے سائنسی طور پر حاصل کئے ہوئے ادراک ہمارے ذہن میں خارجی اشیا کا ایسا تصور پیدا کرتے ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے اصل حقیقت سے مختلف ہو۔ اور نہ اس کی کوئی مثال ملی ہے کہ خارجی اشیا اور خارجی اشیا کے ادراک میں جو حواس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے کوئی فطری اور خلقی تضاد پایا جاتا ہے۔

اس کے بعد کانٹ[۲۶] کے نئے ماننے والے متشککین آتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ کسی شے کے خواص کا صحیح ادراک تو ممکن ہے لیکن ہم کسی ذہنی یا حسی طریقے سے خود اُس شے کو گرفت میں نہیں لا سکتے۔

---

۲۶ ایمونیل کانٹ (پیدائش ۱۷۲۴ء ۔ وفات ۱۸۰۴ء) جرمنی کا ایک نہایت مشہور اور اہم فلسفی گذرا ہے۔ لینن نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ "کانٹ کے فلسفے کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ اس نے مادیت اور تصوریت میں سمجھوتہ کرانے کی کوشش کی، وہ دونوں میں میل ملاپ کرانا، دونوں کے متضاد اور مختلف نوع کے فلسفیانہ رجحانات کو ایک دھاگے میں پرو کر فلسفے کا ایک نیا نظام بنانا چاہتا تھا۔ (باقی صفحہ [illegible] پر)

یہ شے بالذات" ہماری سرحدِ ادراک سے پرے ہے۔ ہیگل نے اس کا جواب یوں دیا کہ کسی شے کے تمام عوارض کا علم خود اُس شے کا علم ہے اور اشیا کا وجود خارجی ہے۔ کانت کے زمانے میں قدرتی اشیا کا علم اتنا کم تھا کہ اس کا یہ گمان قدرتی تھا کہ ان اشیا کے مختصر علم کے پردے میں کوئی پُراسرار "شے بالذات" بھی موجود ہے۔ لیکن سائنس کی غیر معمولی ترقی کی بدولت یہ ناقابل فہم اشیا یکے بعد دیگرے سمجھ میں آتی گئیں۔ ان کا تجزیہ کیا گیا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھیں دوبارہ پیدا کیا گیا۔

جب کانت یہ کہتا ہے کہ ہم سے باہر کی چیز یعنی 'شے بالذات' ہمارے ادراک سے مطابقت رکھتی ہے تو وہ ادیت پرست معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے بعد ہی وہ یہ دعوے کرتا ہے کہ یہ شے بالذات سرحد ادراک کے پرے ہے اور نہ تو اس کا علم ہو سکتا ہے اور نہ تجربہ کیا جا سکتا ہے تو اس وقت وہ تصوریت پرست معلوم ہونے لگتا ہے۔ کانت جب یہ کہتا ہے کہ تجربہ ہمارے علم کا واحد ذریعہ ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فلسفۂ محسوسیات اور فلسفۂ محسوسیات کے ذریعے سے بعض حالتوں میں فلسفۂ مادیت سے قریب ہونے لگتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی زمان و مکان اور علمیت کے ادراک کو تجربے سے آزاد مان کر کانت تصور پرستی کی طرف جھکنے لگتا ہے۔ بااصول مادیت پرست اور بااصول تصوریت پرست، اور خالص، لا ادریے، اور ہیوم کے ماننے والے غرضکہ سبھی کانت کے اس بے اصولے پن کی وجہ سے اس پر معترض ہیں۔

("مادیت اور تجربی تنقید" از لینن)

انیسویں صدی میں کانت کے کچھ نئے ماننے والے پیدا ہوئے جو 'نو کانتی' کے نام سے مشہور ہیں۔ انھوں نے کانت کے فلسفہ کے اس دورنگے پن کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی۔ اور انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں دوسری انٹرنیشنل کے جن لوگوں نے مارکسیت سے غداری کر کے اس میں ترمیم کرنے کی کوشش کی (جیسے برنسٹائن) اور پھر آگے چل کر فاشزم کی طرف قدم بڑھایا (جیسے میکس ایڈلر وغیرہ) ان کے خیالات بھی "نو کانتی" فلسفے پر مبنی تھے۔

اور ظاہر ہے کہ جس چیز کو ہم دوبارہ پیدا کریں اُسے ہم ناقابل ادراک نہیں کہہ سکتے۔ انیسویں صدی کے ابتدائی نصف حصے میں علم کیمیا نامیاتی[۲۷] اشیا کو پُراسرار سمجھتا تھا۔ لیکن اب یکے بعد دیگرے ہم ان نامیاتی اشیا کو کسی نامیاتی عمل کے بغیر ان کے کیمیاوی عناصر کی مدد سے تیار کر لیتے ہیں اور آج کل کے ماہرین کیمیا کا تو یہاں تک دعویٰ ہے کہ اگر کسی شے کی کیمیاوی ترکیب کا علم ہو جائے تو وہ شے اپنے عناصر ترکیبی سے تیار کی جا سکتی ہے۔ ابھی تک ہمیں اعلیٰ ترین نامیاتی اشیا یعنی بیضین[۲۸] دار اجسام کی کیمیاوی ترکیب کا علم نہیں ہوا ہے۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی مسلسل کوشش سے، خواہ اس میں صدیاں ہی کیوں نہ لگ جائیں، اس کا پتہ نہ چلا لیں اور مصنوعی بیضین نہ بنانے لگیں۔ لیکن اگر کبھی وہ وقت آیا تو ہم نامیاتی زندگی بھی پیدا کرنے لگیں گے۔ کیونکہ زندگی ادنیٰ شکل میں ہو یا اعلیٰ شکل میں، بیضین دار اجسام کے وجود کی طبعی حالت کا نام ہے۔

ہمارے یہ شکگین اپنے ذہن میں یہ منطقی حدود قائم کر لینے کے فوراً ہی بعد ٹھیٹ مادّیین کی طرح باتیں کرنے لگتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے مادہ اور حرکت جس کا نیا نام توانائی ہے نہ تو پیدا کئے جا سکتے ہیں اور نہ فنا کئے جا سکتے ہیں۔ البتہ ہمارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ وہ کسی نہ کسی وقت میں پیدا نہیں کئے گئے۔ لیکن اگر آپ اُن کے اس اعتراف کو کہیں بطور مثال پیش کریں تو وہ فوراً کترا جاتے ہیں۔ وہ تجریدی طور پر تو روحانیت کے امکان کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن "کسی شکل" میں ماننے کے لئے تیار نہیں۔ وہ کہیں گے کہ جہاں تک ہمیں علم ہے کائنات کا کوئی خالق یا فرمانروا نہیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے مادہ اور قوت نہ تو پیدا کئے جا سکتے ہیں اور نہ فنا کئے جا سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ذہن توانائی کی ایک شکل اور دماغ کا ایک عمل ہے۔ جہاں

---

۲۷ نامیاتی اشیا، سائنس کی زبان میں ان تمام چیزوں کو کہتے ہیں جن میں 'نمو' یعنی بڑھنے کی خاصیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً حیوانات، نباتات وغیرہ۔

۲۸ بیضین ایک قسم کا سفید، انڈے کی سفیدی جیسا مادہ ہے جو حیوانی اجسام، بیجوں اور گودے دار جڑوں میں پایا جاتا ہے۔

تک ان کی سائنٹفک حیثیت کا تعلق ہے، جہاں تک ان کو کسی چیز کا علم ہے، وہ مادیت پرست ہیں۔ لیکن اپنی سائنس کے باہر اس دائرے میں جس کا انھیں کوئی علم نہیں وہ اپنی لاعلمی کو یونانی زبان کا جامہ پہنا دیتے اور اسے "لا ادریت" کہنے لگتے ہیں۔

بہر صورت ایک بات بالکل صاف ہے وہ یہ کہ اگر میں مشکل بھی ہوتا تب بھی ظاہر ہے کہ اس چھوٹی سی کتاب میں تاریخ کا جو مفہوم پیش کیا گیا ہے اسے "تاریخی لا ادریت" ہرگز نہ کہتا۔ مذہبی لوگ مجھ پر ہنسیں گے۔ مشکین ناراض ہو کر پوچھیں گے کہ کیا میں ان کا مذاق اڑانا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ اگر میں دوسری بہتیری زبانوں کی طرح انگریزی میں بھی تاریخی مادیت کا لفظ استعمال کروں تو انگریز شریف زادے میری اس جرأت پر بہت زیادہ بدحواس نہ ہوں گے۔ تاریخی مادیت سے میری مراد تاریخی ارتقا کا وہ تصور ہے جو تاریخ کے اہم واقعات کی علت اولیٰ اور بنیادی محرکات کو سماج کی اقتصادی ترقی میں، طریقہ پیداوار اور تبادلے کی تبدیلیوں میں، سماج کی طبقاتی تقسیم اور ان طبقات کی باہمی جدوجہد میں تلاش کرتا ہے۔

اگر میں یہ ثابت کر دوں کہ تاریخی مادیت انگریز شریف زادوں کے لئے بھی مفید ہے تو وہ میری اس گستاخی کو شاید آسانی سے معاف کر دیں۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ چالیس پچاس برس پہلے انگلستان میں بسنے والے ہر مہذب پردیسی کو جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی، وہ متوسط طبقہ کے انگریز شرفا کی مذہبی تنگ نظری اور حماقت تھی۔ اب میں یہ ثابت کروں گا کہ اس وقت کے متوسط طبقے کے انگریز شرفا عقلمند پردیسیوں کو جس قدر احمق معلوم ہوتے تھے، حقیقت میں وہ اتنے احمق نہیں تھے۔ ان کے مذہبی رجحانات کے اسباب موجود تھے۔

جب یورپ عہد وسطیٰ سے ابھرا تو شہری متوسط طبقہ ہی اس کا انقلابی عنصر قرار پایا۔ اس نے جاگیرداری نظام میں ایک مسلم حیثیت حاصل کر لی۔ لیکن جلد ہی یہ حیثیت بھی اس کے پھیلاؤ کے لئے ناکافی ہو گئی اور متوسط طبقے کی ترقی کے ساتھ جاگیرداری نظام کا قائم رکھنا ناممکن ہو گیا۔ اسی لئے جاگیرداری نظام کو ختم ہو جانا پڑا۔

جاگیرداری نظام کا ایک بڑا بین الاقوامی مرکز رومن کیتھلک کلیسا تھا۔ اس نے تمام اندرونی لڑائیوں کے باوجود جاگیرداری نظام میں جکڑے ہوئے سارے مغربی یورپ کو ایک عظیم الشان سیاسی رشتے میں گوندھ دیا تھا جو سرزمین یونان اور مسلم ممالک دونوں کے خلاف تھا۔ اس نے جاگیرداری اداروں کے گرد نورانی تقدیس کا ایک ہالہ کھینچ دیا تھا۔ اور جاگیرداری نمونے پر اپنی ایک الگ کلیسائی حکومت بھی قائم کرلی تھی۔ انتہا یہ کہ یہی کلیسا سب سے بڑا جاگیردار اور کیتھلک دنیا کے پورے ایک تہائی علاقہ پر قابض تھا۔ لہٰذا ہر ملک کے غیر کلیسائی جاگیرداری نظام پر کامیاب حملہ کرنے سے پہلے اس مقدس اور مرکزی ادارے کو تباہ کرنا ضروری تھا۔

متوسط طبقے کی ترقی کے ساتھ ساتھ سائنس میں بھی نشاۃ ثانیہ کا زبردست دور شروع ہوا۔ علم نجوم، علم جر ثقیل، علم طبیعیات علم تشریح البدن اور علم عضویات دوبارہ زندہ ہوتے۔ اور سرمایہ داروں کو صنعتی پیداوار کی ترقی کے لئے ایک ایسی سائنس کی ضرورت پڑنے لگی جو قدرتی اشیا کے طبعی خواص اور قدرتی طاقتوں کے حرکت کرنے کے طریقے متعین کر سکے۔

اب تک سائنس کلیسا کی اطاعت گذار کنیز تھی اور اسے عقائد کے قائم کئے ہوئے حدود سے آگے بڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اُسے حقیقی معنی میں سائنس بھی نہیں کہہ سکتے۔ سائنس نے کلیسا کے خلاف بغاوت کردی۔ سرمایہ داروں کی گاڑی سائنس کے بغیر نہیں چل سکتی تھی۔ لہٰذا اُنھیں بھی بغاوت میں شریک ہونا پڑا۔ گو ہم نے ایسی صرف دو مثالیں بیان کی ہیں جن میں بڑھتے ہوئے متوسط طبقے کو مذہب سے ٹکر لینی پڑی، لیکن ان مثالوں سے دو باتیں صاف ہوجاتی ہیں۔ اوّل یہ کہ رومن کیتھلک کلیسا کے جھوٹے دعووں کے خلاف جدوجہد میں سب سے زیادہ جس طبقے کا مفاد وابستہ تھا وہ سرمایہ داروں کا طبقہ تھا۔ دوم یہ کہ اُس وقت جاگیری نظام کے خلاف ہر جدوجہد کو مذہبی رنگ اختیار کرنا پڑا اور سب سے پہلے کلیسا ہی سے ٹکر لینی پڑی۔ لیکن یونیورسٹیوں اور شہری تاجروں نے مخالفت کی جو آواز اٹھائی وہ دیہاتی عوام میں بھی گونجی۔ یہ دیہاتی عوام زیادہ تر کسان تھے جنھیں زندہ رہنے کے تئے ہر جگہ اپنے۔۔ مذہبی اور غیر مذہبی۔

جاگیر دار و آقاؤں سے لڑنا پڑتا تھا۔

جاگیری نظام کے خلاف سرمایہ داروں کی طویل جد و جہد تین فیصلہ کن لڑائیوں میں اپنے عروج کو پہونچی۔ پہلی لڑائی وہ تھی جسے جرمنی کے پروٹسٹنٹ اصلاح دین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لوتھر[۲۹] نے رومن کلیسا کے خلاف جنگ کی جو آواز بلند کی اس کی وجہ سے دو سیاسی بغاوتیں ہوئیں پہلی لڑائی فرانز فان سکین جین کی قیادت میں (۱۵۲۳ء) میں چھوٹے امرا نے کی۔ دوسری بغاوت کسانوں نے ۱۵۲۵ء میں کی۔ یہ دونوں بغاوتیں، سب سے زیادہ دلچسپی لینے والی جماعتوں یعنی شہری تاجروں کے تذبذب کی وجہ سے ناکام رہیں یہاں اس تذبذب کے اسباب پر بحث نہیں کی جاسکتی اس وقت سے یہ جنگ مقامی نوابوں اور مرکزی حکومت کی باہمی جد و جہد بن کر رہ گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو سو برس کے لئے یورپ کی سرگرم قوموں میں جرمنی کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ البتہ لوتھر کی اصلاحی تحریک سے ایک نئے عقیدے کی بنیاد پڑ گئی جو مطلق العنان ملوکیت کے حسب حال تھا۔ چنانچہ شمال مشرقی جرمنی کے کسانوں نے جیسے ہی لوتھر کا مذہب اختیار کیا ان کی آزادی چھن گئی اور وہ آزاد انسان کے بجائے زرعی غلام ہو گئے۔

لیکن جس جگہ لوتھر ناکام رہا تھا وہاں کالون[۳۰] کی جیت ہوئی۔ کالون کا عقیدہ اس وقت کے سب سے انتہا پسند اور جبری سرمایہ داروں کے لئے موزوں تھا۔ اس کا نظریۂ تقدیر اس واقعہ کی مذہبی تشریح تھا کہ مسابقت کی تجارتی دنیا میں کامیابی یا ناکامی انسان کے ذاتی عمل یا ہوشیاری پر نہیں بلکہ ایسے حالات پر منحصر ہوتی ہے جو اس کے قابو سے باہر ہوتے ہیں۔ تجارتی کامیابی یا ناکامی انسان کے ارادے یا عمل کے بجائے بعض نامعلوم اور برتر معاشی قوتوں کے

---

۲۹ مارٹن لوتھر ۱۴۸۳ء ـ ۱۵۶۴ء جرمن مبلغ جس نے سب سے پہلے پاپائے روم اور کیتھولک کلیسا کے بین الاقوامی اقتدار کے خلاف آواز اٹھائی دراصل یہ یورپ کے مختلف ملکوں بالخصوص جرمنی کی وطنی تحریک کی آواز تھی۔

۳۰ جان کالون۔

رحم وکرم پر ہے۔ یہ بات صنعتی انقلاب کے اس دور میں خاص طور سے درست تھی جب کہ تمام پرانے تجارتی راستوں اور مرکزوں کی جگہ نئے مرکز اور راستے قائم ہو رہے تھے۔ ہندستان اور امریکہ کے دروازے ساری دنیا کے لئے کھل چکے تھے اور سونے اور چاندی کی قدر بھی جو علم معاشیات کا سب سے مقدس جزو ایمان تھی متزلزل ہو رہی تھی۔ کالون کے کلیسا کا دستور اساسی خالص جمہوری اور عوامی تھا۔ اور جب خدا کی بادشاہت جمہوری ہو چکی تو پھر اس دنیا کی بادشاہتیں بادشاہوں پادریوں اور نوابوں کے ماتحت کیسے رہ سکتی تھیں؟ لوتھر اور کالون کے مذہب میں یہی فرق تھا کہ اگر لوتھر کا مذہب جرمنی کے فرماں رواؤں کے ہاتھ میں ایک اطاعت گزار آلہ بنا تو کالون کے مذہب نے اس کے برعکس ہالینڈ میں جمہوریت قائم کی اور انگلستان اور اسکاٹ لینڈ میں سرگرم جمہوری جماعتیں بنائیں۔

سرمایہ داروں کو اپنی دوسری جدوجہد میں کالون کے مذہب سے بڑی مدد ملی۔ انھیں اپنے لئے بنے بنائے نظریے مل گئے۔ اس جدوجہد کا آغاز انگلستان میں ہوا جسے وہاں کے شہری متوسط طبقے نے شروع کیا اور دیہات کے کسانوں نے پروان چڑھایا۔ یہ عجیب بات ہے کہ سرمایہ داروں کی تینوں لڑائیوں میں لڑنے والی فوج، کسان طبقے ہی نے مہیا کی۔ درآنحالیکہ یہی وہ طبقہ ہے جو اس فتح کے بعد، اس فتح کے معاشی نتائج کے باعث، سب سے زیادہ تباہ ہوا۔ چنانچہ کرام ویل[31] کی فتح کے سو برس بعد انگلستان کے چھوٹے کسانوں کا کہیں نام و نشان بھی نہ رہ گیا۔ بہرحال اگر چھوٹے کسانوں اور شہروں کے ادنیٰ عوام نے ساتھ نہ دیا ہوتا تو اس لڑائی میں جیتنا اور بادشاہ چارلس اول کو پھانسی دے دینا اکیلے سرمایہ داروں کے بس کی بات نہ تھی۔ سرمایہ داروں کی ان فتوحات کی

---

[31] کرام ویل۔ ۱۶۳۹ء سے ۱۶۵۸ء تک انگلستان کا حکمراں۔ خانہ جنگی میں بادشاہ چارلس اول کے خلاف جمہوری فوجوں کا لیڈر۔ زمیندار۔ چارلس اول کے قتل کے بعد برطانیہ کا حاکم ہوا اور آہستہ آہستہ آئین پسندی اور جمہوریت کے عناصر کو کچلنے لگا۔ آخر زمانے میں فوجی حکومت قائم کی۔

جس طرح بھی چین کے لئے خود زمانے نے پورا سامان مہیا کر دیا تھا انقلاب کو اور آگے بڑھانا ضروری تھا۔ چنانچہ بالکل یہی صورت ۱۷۹۳ء کے انقلاب فرانس اور ۱۹۴۹ء کے انقلاب چین میں پیش آئی۔ سچ تو یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ سماج کے ارتقا کا ایک قانون یہی ہے۔

اس انقلابی تحریک کی زیادتیوں کا رد عمل ہونا ضروری تھا۔ یہ جوابی رد عمل اس حد اعتدال سے بھی گزر گیا جہاں وہ قائم رہ سکتا تھا۔ آخر کار ایک عرصے تک بھٹکنے کے بعد ایک نیا مرکز ثقل مل گیا۔ جہاں سے پھر نیا دور شروع ہوا۔ انگلستان کا وہ شاندار عہد جسے شرفا "بغاوت عظیم" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے بعد کی کشمکش نسبتاً ایک معمولی سے واقعے کے ہاتھوں جسے لبرل مورخین "انقلاب درخشاں" کہتے ہیں ختم ہو گئی۔

نئے دور کا آغاز بڑھتے ہوئے متوسط طبقے اور سابق جاگیری زمینداروں کی مصالحت سے ہوا۔ زمینداروں کا طبقہ جسے آج کی طرح اُس وقت بھی اشرافیہ کہتے تھے دھیرے دھیرے خود سرمایہ دار ہوتا جا رہا تھا۔ انگلستان کی خوش قسمتی تھی کہ پرانے نواب، وارس آف دی روزیز؎ (گلاب کے پھولوں کی جنگ) میں کٹ مر گئے تھے۔ اُن کے جانشین تھے تو پرانے خاندانوں ہی سے لیکن وراثت کی اس شاخ سے آئی دور جا پڑے تھے کہ اُن کے رجحانات اور عادات جاگیردارانہ ہونے کے بجائے سرمایہ دارانہ تھے۔ وہ روپے کی قدر جانتے تھے چنانچہ انھوں نے سیکڑوں چھوٹے کاشتکاروں کو بے دخل کر کے کھیتوں میں بھیڑوں کے لئے چراگاہیں بنا دیں۔ اس طرح ان کھیتوں کا لگان بڑھ گیا۔ ہنری ہشتم نے کلیسائی زمینداریاں چھین لیں اور اُن کی جگہ نئے سرمایہ داروں کو زمیندار مقرر کیا۔ جاگیرداروں کی یہ شکل سترھویں صدی میں بھی

؎ گلاب کے پھولوں کی لڑائی۔ حکومت پر اقتدار حاصل کرنے کے لئے برطانیہ کے نوابوں کی تیس سالہ خانہ جنگی (۱۴۵۵ء تا ۱۴۸۵ء) جس میں اکثر بڑے بڑے نوابی خاندان تباہ ہو گئے۔ اسے گلاب کے پھولوں کی لڑائی اس وجہ سے کہتے ہیں کہ فریقین کے سرکردہ نواب تھے جن کا خاندانی نشان گلاب کا پھول تھا۔

کشت جاری رہی اور اُس کا نتیجہ بھی یہی نکلا۔ یہی وجہ ہے کہ ہنری ہشتم کے زمانے ہی سے انگریز اشرافیہ نے صنعتی ترقی کی روک تھام کرنے کے بجائے اُس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ انگلستان میں بڑے بڑے زمینداروں کا ایک ایسا طبقہ ہمیشہ موجود رہا ہے جس نے معاشی یا سیاسی اغراض کی بنا پر بڑے بڑے سرمایہ داروں اور ساہوکاروں سے میل جول رکھا۔ اسی وجہ سے ۱۶۸۹ء[۳۳] کا سمجھوتہ آسانی سے تکمیل پا گیا۔ عہدوں اور وزارتوں کی سیاسی لوٹ پر بڑے بڑے زمیندار خاندانوں کے لئے اس شرط پر چھوڑ دی گئی کہ وہ رگ تجارت اور روپیہ کا لین دین کرنے اور صنعت و حرفت میں سرمایہ لگانے والے متوسط طبقے کے معاشی مفاد کی پوری پوری نگرانی کریں۔ یہ معاشی مفاد اُس وقت تک اتنا مضبوط ہو چکا تھا کہ قوم کی عام پالیسی اُسی کے اشاروں پر چلتی تھی۔ تفصیلات کے سلسلے میں تو کبھی کبھی جھڑپ ہو جاتی لیکن مجموعی طور سے اشرافیہ طبقہ کا یہ حکمراں گروہ اچھی طرح جان گیا تھا کہ اُس کی معاشی خوش حالی، صنعت اور تجارت پیشہ متوسط طبقے ہی کے مفاد سے وابستہ ہے۔

۳۳۔ ۱۶۸۹ء کی سیاسی تبدیلیاں برطانوی تاریخ میں "انقلاب درخشاں" کے نام سے مشہور ہیں۔ شاہ جیمس ثانی کو جو خالص جاگیریت اور بادشاہی مطلق العنانی کے دوبارہ تسلط کا آرزومند تھا، تخت چھوڑ کر فرار ہو جانا پڑا۔ لیکن بڑے بڑے سرمایہ داروں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ زمیندار طبقہ سے صلح کر لی جائے۔ جیمس ثانی رخصت ہوا مگر بادشاہی قائم رہی۔ جیمس کا داماد ولیم جو ملک ہالینڈ کا والی تھا ولیم سوم کے نام سے انگلستان کا بادشاہ بنایا گیا۔ لیکن بادشاہ کی سیاسی اہمیت اب ایک نمائشی کھلونے سے زیادہ نہیں رہی۔

سرمایہ دار تھے تو مسکین مگر اُس وقت سے وہ انگلستان کے حکمراں طبقوں کا ایک اہم جزو بن گئے۔ اور دوسرے حکمراں طبقوں کی طرح اُن کا مفاد بھی یہی ہو گیا کہ ملک کی مزدور پیشہ اکثریت کو اپنا محکوم بنائے رکھیں۔ تاجر اور کارخانہ دار خود آقا بن بیٹھے اور اپنے کلرکوں، گھر کے نوکروں اور دکانوں اور کارخانوں میں کام کرنے والوں کے "قدرتی افسر" قرار پائے۔ سرمایہ داروں کا فائدہ اسی میں تھا کہ اِن لوگوں سے جتنا زیادہ اور جتنا اچھا کام لے سکیں لیں۔ اس کے لئے اِن مزدوروں وغیرہ کو اطاعت گزاری کی معقول تعلیم دلانا ضروری تھا۔ یہ نئے آقا بذات خود مذہبی تھے اور اپنے اسی مذہبی پرچم کے تلے اُنھوں نے بادشاہ اور نوابوں کا مقابلہ کیا تھا۔ ان لوگوں کو مذہب کی جھولی میں سے ایسی چیزیں نکالنے میں دیر نہ لگی جن کی مدد سے وہ اپنے قدرتی محکوموں کو بہ آسانی بہکا کر اُنھیں آقاؤں کی اطاعت کی تعلیم دیتے —— ایسے آقا جو خدا کی طرف سے ان پر مسلط ہوئے تھے —— مختصر یہ کہ انگریز سرمایہ داروں کو "پست طبقوں" یعنی قومی دولت پیدا کرنے والی اکثریت کو دبانے کی کوشش میں حصہ لینا پڑا۔ اور اس مقصد کے لئے جو ذریعے استعمال کئے گئے اُن میں مذہب کا بڑا ہاتھ تھا۔

ایک اَور چیز جس نے انگریز سرمایہ داروں کے مذہبی رُجحانات کو قوت پہونچائی، انگلستان میں مادیت کی ترقی تھی۔ اس نئے نظریے سے متوسط طبقے کے مذہبی جذبات ہی کو ٹھیس نہ لگی بلکہ اس نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ وہ ایک ایسا فلسفہ ہے جو صرف عالموں اور متمدن لوگوں ہی کے لئے موزوں ہے۔ در آنحالیکہ مذہب سے اَن پڑھ عوام اور سرمایہ دار دونوں کی تسکین ہوتی تھی۔ حد ہو گئی کہ ہابس مادیت کے فلسفہ کو شاہی اختیارات خصوصی اور مطلق العنانی کی حمایت میں لے کر آیا۔ اور اُس کے جانشینوں —— بولنگ بروک اور شیفٹس بری —— کے ہاتھوں میں مادیت کی جدید وحدانیت پرست شکل بھی ایسی ہی رہی کہ اُس سے اشرافیوں اور دوسرے چیدہ لوگوں

۲۴ وحدانیت پرستی جس کے لئے انگریزی اصطلاح ڈی اِزم ہے اس عقیدت کا نام ہے جس میں خدا کے وجود کا اقرار مگر دین کا انکار ہوتا ہے۔ اس عقیدے کے بموجب خدا کی حیثیت (باقی صفحہ ۴۱ پر)

ہی کی حمایت ہوتی تھی۔ چنانچہ متوسط اور سرمایہ دار طبقہ مادیت سے اُس کی لامذہبیت کی وجہ
نیز اُن جوسے بھی نفرت کرنے لگا کہ مادیت کا سیاسی پہلو سرمایہ داروں کے خلاف تھا۔ چنانچہ وہ
پروٹسٹنٹ جماعتیں جنھوں نے اسٹوارٹ خاندان کے بادشاہوں کی مخالفت میں جھنڈے بلند
کئے تھے اور ان کے خلاف لڑائی میں شرکت کی تھی، اشرافیوں کا (جو وحدانیت پرست یا مادہ
پرست تھے) ساتھ دینے کے بجائے ترقی پسند متوسط طبقوں کا ساتھ دیتی رہیں اور اُن کی قوت
کا سبب بنی رہیں۔ اور آج بھی لبرل پارٹی کی ریڑھ کی ہڈی بنی ہوئی ہیں۔

اسی درمیان میں مادیت انگلستان سے فرانس پہونچی، اور مادیت کے ایک اور مسلک
سے جو ڈیکارٹیت[۳۵] کی ایک شاخ مادہ پیدا ہوئی اور آگے چل کر فرانس میں بھی اوّل اوّل وہ اشرافیہ
ہی کا ایک نظریہ رہی۔ لیکن جلد ہی اُس کی انقلابی نوعیت نے اپنا سکہ جما لیا۔ فرانسیسی مادئین
نے اپنی تنقید صرف مذہبی عقائد ہی تک محدود نہ رکھی بلکہ ہر سیاسی ادارے اور سائنٹفک روایت
کو جو اُن کے سامنے آئی تنقیدی نظر سے دیکھا۔ اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اُن کا نظریہ ہمہ گیر

(سلسلہ صفحہ ۳۳) صرف مسبب الاسباب کی ہے۔ دنیا کی تخلیق تو اس نے کی مگر اب ان مانی دہ
اسے بدل نہیں سکتا۔ گویا اس کی حالت انگلستان کے بادشاہ کی سی ہے جس کے ہاتھ پیر قانون سے جکڑے
ہوئے ہیں جنھیں وہ خود پارلیمنٹ کی مرضی کے بغیر بدل بھی نہیں سکتا۔ یہ عقیدہ اصل میں مادیت کے اصول
کا درپردہ اقرار ہے۔

۳۵ ڈیکارٹ سترھویں صدی میں فرانس کا مشہور فلسفی اور ریاضی داں
تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جدید فلسفہ اور جدید ریاضی کا بانی ہے۔ اس کے فلسفہ کا ایک بنیادی مسئلہ یہ ہے
کہ تمام اشیاء، ذہن یا مادہ دونوں میں سے کسی ایک سے تعلق رکھتی ہیں۔ خود ذہن اور مادہ میں کوئی رشتہ نہیں۔
ذہن کی خاصیت خیال ہے جو نہ تو جگہ گھیرتا ہے اور نہ فضا میں کسی خاص ترتیب کا حامل ہے۔ مادہ کی خاصیت
جگہ گھیرنا اور فضا میں دائم ہونا ہے۔ اس بنا پر ڈیکارٹ کا خیال تھا کہ تمام فضا میں کوئی نہ کوئی چیز
ضرور موجود ہونی چاہئے۔ ڈیکارٹ کے زمانے سے فضا محض خالی چیز ہونے کے بجائے ایک خارجی
شے ہو گئی جس کا حقیقی وجود تسلیم کیا گیا۔

سرمایہ دار طبقہ اور بھی زیادہ مذہبی ہو گیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہی مذہب دہشت انگیزوں کی حکومت بچا رہا ہے کہ عوام کے مذہبی جذبات کے فنا ہونے والی نتیجہ ہوتا ہے۔ مادیت کا فلسفہ فرانس سے نکل کر جس قدر ملکوں میں جس قدر پھیلتا گیا اور اسی قسم کے دوسرے نظریوں کی وجہ سے خاص کر جرمن فلسفے کی وجہ سے جتنا زور پکڑتا گیا اور جس قدر مادیت اور آزاد خیالی یورپ کے بڑھتے گئے ویسے ویسے اس کی الٹی صفات بنتی گئیں۔ انگریز متوسط طبقہ اپنے مذہبی عقائد پر اتنا ہی زیادہ ہٹ دھرمی سے جمتا گیا۔ یہ عقائد ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود سب کے سب مذہبی اور سیاسی عقائد تھے۔

انقلاب کی وجہ سے فرانس میں ادھر سرمایہ داروں کی سیاسی اہمیت بڑھ گئی کہ ادھر انگلستان میں واٹ[1]، آرک رائٹ[2]، کارٹ رائٹ[3] وغیرہ نے ایک ایسے صنعتی انقلاب کی بنا ڈالی جس کی وجہ سے سماجی اقتدار کا مرکز ثقل اپنی پرانی جگہ سے ہٹ گیا۔ سرمایہ داروں کی دولت زمیندار اشرافیوں کی نسبت زیادہ تیزی سے بڑھنے لگی۔ خود سرمایہ دار طبقے میں بھی اشرافیے کو یعنی بینکروں اور ساہوکاروں کو، کارخانے دار روز بروز پیچھے ہٹانے لگے۔

باوجودیکہ سلطنتوں کے بکھرتے ہی دھیرے دھیرے جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں وہ سرمایہ دار ہی کے حق میں تھیں پھر بھی یہ کہنا اب فریقین کی نسبتی قوتوں کے مطابق نہیں رہ گیا تھا۔ فریقین کی اہمیت بھی بدل گئی تھی۔ ۱۸۱۵ء کا سرمایہ دار پچھلی صدی کے سرمایہ دار سے بالکل مختلف تھا۔ وہ سیاسی قوت جو اب تک اشرافیوں کے ہاتھ میں تھی اور جسے وہ نئے صنعتی سرمایہ داروں کی چالوں کو روکنے کے لئے استعمال کرتے تھے، نئے سماجی مفاد سے ٹکر لینے لگی۔ یعنی اشرافیوں کو دوبارہ مقابلے کی ضرورت پیش آئی۔ ظاہر ہے کہ اس مقابلے میں جیت نئی سماجی قوت، سرمایہ داروں،

---

[1] واٹ

[2] آرک رائٹ } کپڑا بننے کی مشین میں اصلاح کرنے والے انگریز جن کی ایجادوں سے اٹھارویں

[3] کارٹ رائٹ } صدی کے آخر میں کارخانوں کی پیداوار میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔

کی ہوتی۔ ۱۸۳۲ء کے انقلاب فرانس سے متأثر ہو کر باوجود سخت مخالفت کے پہلا قانون اصلاحات منظور کیا گیا۔ اس کی وجہ سے پارلیمنٹ میں سرمایہ داروں کا اقتدار بڑھ گیا۔ اس کے بعد غلے کا قانون[1] منسوخ کیا گیا۔ اس چیز نے زمیندار اشرافیوں پر سرمایہ داروں اور خاص کر اُن کے سب سے سرگرم عنصر یعنی کارخانہ داروں کی فوقیت ہمیشہ کے لئے قائم کر دی۔ سرمایہ داروں کی یہ سب سے بڑی لیکن آخری جیت تھی جس میں صرف اُنھیں کے طبقاتی مفاد کو فائدہ پہونچا۔ بعد میں جتنی نوحات ہوئیں اُن میں سرمایہ داروں کو ایک نئی سماجی قوت کو بھی شریک کرنا پڑا۔ یہ سماجی قوت ابتدا میں تو اُن کے ساتھ رہی لیکن جلد ہی اُن کی رقیب بن گئی۔

صنعتی انقلاب نے اُن بڑے بڑے سرمایہ داروں کا ایک طبقہ پیدا کر دیا تھا جن کے پاس کارخانے تھے لیکن ساتھ ہی ایک اور طبقہ بھی اُبھر آیا تھا جو تعداد میں سرمایہ داروں سے کئی گنا بڑا تھا۔ یہ طبقہ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کا طبقہ تھا۔ جس نسبت سے صنعتی انقلاب ایک صنعت کے بعد دوسری صنعت پر غلبہ پاتا گیا، اُسی نسبت سے مزدور طبقے کی تعداد اور قوت بھی بڑھتی گئی۔ مزدور طبقے نے اپنی قوت کا ثبوت سب سے پہلے ۱۸۲۴ء میں یوں دیا کہ اُن قوانین کو جن کی رُو سے مزدوروں کو اپنی انجمن بنانے کی ممانعت تھی پارلیمنٹ سے زبردستی منسوخ کرا لیا۔ قانونی اصلاحات کی شورش کے زمانے میں مزدور طبقہ اصلاح چاہنے والی پارٹی کا انتہا پسند گروہ بن گیا۔

---

[1] غلے کا قانون۔ نپولین سے جنگ کی وجہ سے پولینڈ اور فرانس سے گیہوں کی درآمد بند ہوئی تو برطانیہ میں گیہوں کی قیمت بہت بڑھ گئی۔ گیہوں کے اس نرخ کو برقرار رکھنے کے لئے زمینداروں نے پارلیمنٹ سے غلے کا ایک قانون بھی منظور کرا لیا جس کی رو سے گیہوں کی درآمد ممنوع ہو گئی۔ اس سے شہریوں اور کاشتکاروں دونوں کو بہت تکلیف پہونچی اور اس قانون کو منسوخ کرانے کی تحریک بڑے زور شور سے شروع ہوئی۔

لیکن ۱۸۳۲ء کے قانونی اصلاحات میں بھی انہیں ووٹ دینے کا حق نہ ملا۔ چنانچہ انھوں نے چھ نکات پر
ایک عوامی چارٹر کی شکل میں مرتب کئے۔ اور پھر نئے قانون کی مخالفت کرنے والی سرمایہ داروں
سے الگ ہو کر اپنی ایک علیحدہ جماعت بنائی جسے چارٹسٹ جماعت کہتے ہیں۔ یہ مزدوروں کے
مزدوروں کی پہلی جماعت تھی۔ اس کے بعد انہوں نے ۱۸۳۸ء میں جگہ جگہ جلسوں میں
احتجاجات ... ہوئے جن میں مزدوروں نے ہڑتالیں ... اور لاکھوں ... نے مطالبات
پیش کئے جو سرمایہ دار سماج کے لئے ناقابل قبول تھے۔ اس کے بعد ایک عام ... کا دور
آیا۔ ۱۸۴۲ء کو چارٹسٹوں کو شکست ہو گئی۔ ۱۸۴۸ء میں پیرس کے مزدوروں کی
بغاوت کچلی گئی۔ پھر ۱۸۴۸ء میں انگلستان ... مزدوروں پر ... ہوئیں اور
آخر کار مزدور ... ۱۸۴۷ء ... دس گھنٹے کام کا ... پاس ہو گیا۔ اور ... کئے
گئے مزدور پیشے کے مطالبات کا اثر ... لیکن اس کی قیمت کافی ادا کرنی پڑی۔ انگریز
سرمایہ داروں کو اس بات کا پہلے ہی یقین ہو گیا تھا کہ عوام کے ... کا کام ... ضروری

ا؎ چارٹسٹ تحریک انیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے دہے میں انگلستان میں ... انگریز مزدوروں کی پہلی ... سیاسی تحریک تھی اور انگریز مزدوروں کی اکثریت اس میں شریک تھی۔ مارکس، اینگلس اور لینن کی نظر میں اس تحریک کی تاریخی اہمیت ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہے کہ ۱۸۳۸ء میں مزدوروں نے پارلیمنٹ کے سامنے ایک چارٹر یعنی تحریری یادداشت پیش کی جس میں حسب ذیل مطالبات درج تھے: (۱) اکیس برس اور اس سے زیادہ عمر کے تمام مردوں کو ووٹ دینے کا عام حق دے (۲) ہر سال پارلیمنٹ کا انتخاب ہو (۳) پارلیمنٹ کے ممبروں کو تنخواہ دی جایا کرے (۴) ووٹ دینے کا خفیہ طریقہ ہو (۵) انتخابی حلقے سب جگہ برابر ہوا کریں (۶) پارلیمنٹ میں منتخب ہونے کے لئے صاحب جائداد ہونے کی کوئی شرط نہ ہو۔ ان مطالبات کو حاصل کرنے کے لئے دس سال تک مزدوروں نے جدوجہد کی ... اور ... جماعت ... کوئی طریقہ اختیار کیا گیا۔

ہے۔ ان نئے تجربوں کے بعد تو اس کی ضرورت اور بھی زیادہ محسوس ہونے لگی۔ چنانچہ یورپین سرمایہ داروں کے طنز کے باوجود وہ عوام کی مذہبیت قائم رکھنے کے لئے ہر سال لاکھوں روپیہ صرف کرتے رہے۔

تاریخی ارتقا کا شاید ایک قانون یہ بھی ہے کہ یورپ کے کسی ملک میں سرمایہ دار طبقے کو بلا شرکت غیرے زیادہ عرصے تک وہ سیاسی اقتدار نہیں حاصل رہ سکتا جو زمیندار اشرافیہ کو عہد وسطیٰ میں حاصل تھا۔ خود فرانس میں بھی جہاں جاگیرداری کو بالکل فنا کر دیا گیا تھا، حکومت پر بحیثیت مجموعی تمام سرمایہ داروں کا غلبہ بہت کم عرصہ تک رہا۔ لوئی فلپ (۱۸۳۰ء تا ۱۸۴۸ء) کے عہد میں سرمایہ داروں کی ایک بہت ہی چھوٹی جماعت نے راج کیا۔ سرمایہ داروں کے بہت بڑے حصے کو ووٹ کا بھی حق نہ تھا۔ البتہ دوسری جمہوریت (۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۱ء) میں پورے سرمایہ دار طبقے نے حکومت کی لیکن یہ حکومت صرف تین سال رہی۔ خود انھیں لوگوں کی نااہلی کی وجہ سے وہاں دوبارہ بادشاہت قائم ہوئی۔ صرف اس تیسری جمہوریت کے دور میں سرمایہ دار من حیث الجماعت بیس سال سے زیادہ عرصہ تک حکومت پر قابض رہے، لیکن ان لوگوں میں ابھی سے انحطاط کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ البتہ سرمایہ داروں کی پائیدار حکومت صرف امریکہ جیسے ملکوں میں قائم ہو سکی جہاں جاگیرداری نظام سرے سے ناپید تھا اور سماج کی ابتدا ہی سرمایہ دارانہ طریقے پر ہوئی تھی۔ لیکن فرانس اور امریکہ میں بھی سرمایہ داروں کے جانشین یعنی مزدور، حکومت پر قابض ہونے کی کوشش کرنے لگے ہیں۔

انگلستان میں سرمایہ داروں کو کبھی بلا شرکتِ غیرے حکومت کرنے کا موقع نہ ملا۔ ۱۸۳۲ء کی فتح کے بعد بھی تمام بڑے بڑے سرکاری دفتروں پر زمیندار اشرافیہ ہی کا قبضہ رہا۔ دولت مند متوسط طبقے نے اسے بڑی انکساری سے برداشت کر لیا۔ لیکن جب تک میں نے ایک روشن خیال کارخانہ دار مسٹر ڈبلیو۔ اے۔ فورسٹر کی تقریر نہیں سنی تھی اس انکساری کا راز سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ فورسٹر نے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے بریڈ فورڈ کے نوجوانوں سے کہا کہ اگر دنیا میں آگے بڑھنا ہو تو فرانسیسی پڑھو۔ اور مثال میں اپنا ذاتی تجربہ پیش کیا کہ بحیثیت وزیر جب انھیں اعلیٰ طبقے کے لوگوں سے ملنا جلنا پڑتا تو انھیں بڑی شرمندگی ہوتی۔ کیونکہ اعلیٰ طبقے میں فرانسیسی کی ضرورت انگریزی سے کسی طرح کم نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت انگلستان کا متوسط طبقہ بالکل جاہل اور فرسودہ خیالات والا تھا اور حکومت
کے اعلیٰ عہدے اشرافیہ ہی کے قبضے میں رہتے تھے اس لیے ان کے لیے چند ابتدائی مختلف علوم کی
اور کاروباری مہارت کے سوا دوسری اعلیٰ صفات کی ضرورت نہ تھی۔ متوسط طبقے کی تعلیم کے
بارے میں انیسویں صدی میں جو بحثیں ہوتی رہی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ انگلستان کا متوسط طبقہ آج
بھی اپنے آپ کو اعلیٰ ترین تعلیم کے قابل نہیں سمجھتا بلکہ اپنے بچوں کے لیے سرسری سی تعلیم
کافی سمجھتا ہے۔ چنانچہ غلے کے قوانین کی منسوخی کے بعد بھی کاب ڈن، برائٹ اور دوسرے جیسے لوگ

تک کاروباری معاملات میں اپنی لیاقت و فہم سے بہت بڑھ جاتی ہے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے تک انگریز تاجر
اور انگریزی کے سوا دوسری زبانیں جاننا اپنی قومی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان کے لیے انگریزی کافی تھی۔ یہ
بات کچھ اگرچہ نہیں کہ "یہ عجیب لوگ" انگلستان میں آکر بیٹھے اور غیر ملکوں میں انگریزوں کا مال بیچنے
کا کام سنبھال لیا کرتے۔ انگریز کارخانہ داروں کو یہ بات نہیں سوجھی کہ یہ جو دیسی لوگ ہیں ہمیں
جرمن تھے۔ یہ علاقہ کی غیر ملکی تجارت اور دوسرے کے بڑے سے بڑے ہو چکے تھے۔ اور
غیر ملکوں کو انگریزوں کی براہ راست تجارت کا دائرہ سمٹ سا گیا جیسے ریاست ہائے
متحدہ امریکہ اور جنوبی امریکہ میں محدود ہو گیا تھا۔ انگریز کارخانہ دار یہ نہ دیکھ سکے کہ جرمن اور دوسرے
ملکوں کے تاجر ہنر کے ساتھ تجارت کرتے ہیں اور انھوں نے رفتہ رفتہ ساری دنیا میں تجارتی ایجنسیوں کا
ایک مکمل جال بچھا دیا ہے۔ اور جب چالیس برس پہلے جرمنی نے بڑے پیمانے پر باقاعدہ مال تیار کرنا
شروع کیا تو اس سے اس کو نقل و حمل میں بڑی آسانی ہوئی اور ایک مختصر مدت میں وہ ملک جو پہلے صرف
غلے کی برآمد کیا کرتا تھا اول درجے کا صنعتی ملک بن گیا۔ انگریز کارخانہ داروں نے دیکھا کہ ان کے
گاہک ہاتھ سے نکلے جا رہے ہیں۔ ان کو فکر لاحق ہوئی۔ دوسرے ملکوں میں جنھوں نے اپنے ایجنٹوں اور
سے اس کا سبب دریافت کیا تو پتہ ایک بات ہو یہ نکلی کہ تم اپنے گاہکوں کی زبان نہیں سیکھتے اور ہم سے
یہ امید رکھتے ہو کہ تمھاری زبان میں بات کریں اور تم اپنے گاہکوں کی وضع قطع معاملات اور ذوق پسندیدگی کا کچھ
خیال نہیں رکھتے اور چاہتے ہو کہ وہ تمھاری پسند کا سامان خریدیں۔ ڈوٹ: انگلش

جو اس جد وجہد میں پیش پیش تھے، سرکاری حکومت میں حصہ پانے سے محروم رہے اور کسی کو یہ بات کھٹکی تک نہیں ـــــ کہیں بیس برس کے بعد نئے قانون اصلاح نے ان کے لئے کابینہ کا دروازہ کھولا ـــــ انگریز سرمایہ دار اب تک سماجی کمتری کے احساس سے اس قدر مغلوب ہیں کہ وہ اپنے اور اپنی قوم کے خرچ سے احدیوں کے ایک نمائشی طبقہ کو صرف اس لئے پال رہے ہیں کہ وہ تمام سرکاری تقریبوں میں قوم کی شایان شان نمائندگی کر سکے۔ اور اگر سرمایہ دار طبقہ کا کوئی فرد اس منتخب اور مقرب جماعت میں جو خود اُن ہی کی تخلیق ہے باریاب ہو جاتا ہے تو وہ اسے اپنے لئے باعث عزت سمجھتے ہیں۔

غرضکہ صنعتی اور تجارتی متوسط طبقہ زمیندار اشرافیہ کو سیاسی اقتدار کی کرسی سے ہٹانے میں ابھی پوری طرح کامیاب بھی نہ ہوا تھا کہ ایک اور حریف یعنی مزدور طبقہ میدان میں آگیا۔ چارٹسٹ تحریک اور یورپین انقلابات کے ردِ عمل اور ۱۸۴۸ء اور ۱۸۶۶ء کے درمیان میں انگریزی تجارت کی عدیم المثال وسعت اور ترقی کی وجہ سے (جس کو لوگ غلط طریقے سے آزادانہ تجارت کا نتیجہ بتاتے ہیں حالانکہ اس کا بڑا سبب ریلوے، بحری دخانی جہازوں اور عام طور سے ذرائع آمد و رفت کی زبردست ترقی ہے) مزدور طبقہ ایک بار پھر لبرل پارٹی کا انتہا پسند عنصر بننے پر مجبور ہوا تھا۔ اس کے حق رائے دہندگی کے مطالبات نے دھیرے دھیرے اتنا زور پکڑا کہ ان مطالبات کو مانے بغیر چارہ نہ رہا۔ لبرل پارٹی کے لیڈر ہچکچاتے رہے لیکن ڈزریلی[۴۳] نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ٹوری جماعت کو مزدوروں کے ان مطالبات کو تسلیم کرنے پر آمادہ کیا۔ چنانچہ اُس نے دیہات کے لوگوں کو بھی ووٹ دینے کا حق دلوایا۔ اور نشستوں کی دوبارہ تقسیم کی۔ اس کے بعد

---

۴۳ ـــــ ڈزریلی۔ انیسویں صدی میں برطانیہ کا سامراجی وزیر اعظم ۱۸۷۵ء میں اس نے خدیو مصر سے نہر سویز کے حصے برطانوی حکومت کے لئے خرید لئے۔ اسی زمانے میں مالیاتی سرمایہ داری کو فروغ ہوا۔ اس نے مزدوروں کی انقلابی تحریک سے ڈر کر اور مزدوروں کو لبرل پارٹی کے اثر سے نکال کر قدامت پسندوں کے اثر میں لانے کے لئے ۱۸۶۷ء میں قانون اصلاح پاس کیا۔

لیکن یہ اندازہ کا طریقہ رائج ہے اور مختلف حلقوں میں ووٹ دینے والوں کی تعداد اور آبادی کے لحاظ سے
اور پارلیمنٹ کی نشستوں کو اس طرح تقسیم کیا گیا۔ اس کی وجہ سے انتخاب کے حلقوں میں ایک حد تک
یکسانیت پیدا ہو گئی۔ ان تمام اصلاحوں سے مزدوروں کی ووٹ دینے کی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ
ترقی یافتہ صنعتی حلقوں میں آج انہیں کے ووٹوں کی اکثریت ہے۔ لیکن پارلیمانی حکومت اور انتخابوں کا احترام
سکھانے کی ابھی ویسی ہی ضرورت ہے جس طرح متوسط طبقہ پرانے زمانے میں امراء اور ان کی دولت و احترام
کی نظر سے دیکھتا تھا اسی طرح مزدور طبقے کی اکثریت نے بھی متوسط طبقے کو جسے وہ اپنے سے بہتر سمجھتا
تھا عزت اور احترام کی نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ آج سے پچاس برس پہلے کا انگلش
مزدور انکساری اور اطاعت گزاری کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھا۔ لیکن اگر یہ متوسط طبقہ جو بڑی
کمزوری کی حیثیت رکھتا ہے غور اندیش نکلا۔ اس نے اقتدار حکومت میں مزدور طبقے
کو بہت پامالی کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ اسے چارٹسٹ تحریک کے زمانے ہی میں معلوم ہو گیا تھا
کہ عوام کیا کر سکتے ہیں۔ اسی وقت سے متوسط طبقہ پر یہ ڈر چھایا رہا کہ عوام کے انقلاب کا
کے خوف سے اکثر حکومت برطانیہ کے قانون کا نفاذ ہو سکے۔ چنانچہ عوام کو اخلاقی ذرائع سے خاموش
رکھنے کی ضرورت پڑنے لگی۔ عوام پر کارگر ہونے والے اخلاقی حربوں میں مذہب سب سے زیادہ موثر حربہ
ہے یہی وجہ ہے کہ مدرسوں کے منتظمین زیادہ تر پادری مقرر کئے گئے اور سرمایہ داروں نے ہر قسم
کی بیرونی جبروں کی تحدید پر کافی رقمیں صرف کیں۔ مذہبی علوم سے لے کر سائنس تک۔

برطانیہ کے سرمایہ دار یورپین سرمایہ داروں کی آزاد خیالی اور مذہب کی ڈھیلے پن پر حیرت
کرتے۔ فرانس اور جرمنی کے مزدور باغی ہو گئے تھے ان میں سوشلزم کے جراثیم پوری طرح پیدا
ہو گئے تھے اور وہ معقول اسباب کی بنا پر اس بات پر بالکل آمادہ ہو گئے تھے کہ کالونی ذرائع ہی
سے اقتدار حاصل کیا جائے۔ یورپ کے عوام روز بروز زیادہ باغی ہوتے گئے اور فرانس اور
جرمنی کے سرمایہ داروں کو سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ آخر کار اپنی آزاد خیالی کو خیرباد
کہیں بالکل اسی طرح جیسے کوئی ڈراؤنا شکل دکھانے کے لئے چادر میں منہ چھپائے لیکن جب وہ

کسی سمندری بیماری کا شکار ہو تو جلتا ہوا سگار پانی میں پھینک دے۔ مذہبی تقدس کا مذاق اُڑانے والے یہ سرمایہ دار یکے بعد دیگرے اپنے ظاہری طرزِ عمل میں پاکباز بنتے گئے۔ کلیسا اور اُس کے رسوم اور مقررہ عقاید کا ذکر ادب سے کرنے لگے اور جہاں تک ناگزیر تھا ان کی پُردی بھی کرنے لگے۔ مادّیت کو مان کر وہ بہت پچھتائے۔ اُنھوں نے طے کیا کہ مذہب کو عوام کے لئے زندہ رکھنا ضروری ہے اور سماج کو مکمل تباہی سے بچانے کا صرف یہی ایک آخری ذریعہ ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اُنھیں یہ راز اُس وقت معلوم ہوا جب وہ مذہب کو تباہ کرنے کی آخری کوشش کر چکے تھے۔ اب انگریز سرمایہ داروں کو موقع ملا کہ وہ یورپین سرمایہ داروں کا مذاق اُڑائیں اور اُنھوں نے کہنا شروع کیا کہ "ارے بیوقوفو! ہم تو تمھیں دو سو برس پہلے ہی یہ راز بتا دیتے۔"

لیکن ہمیں "اندیشہ" ہے کہ نہ تو انگریزوں کا مذہبی کٹرپن اور نہ یورپ کے سرمایہ داروں کے عقائد کی تبدیلی مزدور طبقے کی بڑھتی ہوئی لہر کو روک سکے گی۔ مانا کہ روایت ایک ایسی قوت ہے جو ترقی کو روکتی ہے اور تاریخ کی رفتار کو سُست کرتی ہے لیکن ایک مجہول اور بے عمل قوت ہونے کی وجہ سے اُس کا ختم ہو جانا لازمی ہے۔ لہٰذا مذہب بھی سرمایہ دار سماج کی مستقل ضمانت نہیں کر سکتا۔ اگر دراصل ہمارے قانون، فلسفیانہ اور مذہبی خیالات سماج کے معاشی تعلقات ہی کے مختلف پہلو ہیں تو ہمارے یہ خیالات زیادہ عرصے تک اِن معاشی تعلقات کی تبدیلی کے اثرات کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور نہ ان سے متأثر ہوئے بغیر رہ سکتے۔ اگر خدائی الہام پر ہمارا ایمان ہو تو دوسری بات ہے ورنہ ہمیں ماننا پڑے گا کہ کوئی مذہبی اُصول کسی گرتی ہوئی سماج کو سنبھال نہیں سکتا۔

سچ تو یہ ہے کہ خود انگلستان میں عوام دوبارہ چونکنے لگے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مختلف قسم کی سوداتوں میں جکڑے ہوئے ہیں ایک طرف سرمایہ دارانہ روایتیں ہیں مثلاً یہ عام خیال کہ انگلستان میں صرف دو سیاسی جماعتیں ہو سکتی ہیں، لبرلوں کی اور قدامت پرست توریوں کی۔ اور مزدور طبقے کو لبرل پارٹی کے ذریعے نجات حاصل کرنا چاہیئے۔ پھر مزدوروں کی اپنی روایتیں ہیں جو اُس وقت سے چلی آ رہی ہیں جب کہ اُنھوں نے پہلی بار آزادانہ قدم بڑھانے کی کوشش

کی تھی۔ مثلاً اگر پرانی مزدور سبھائیں کسی ایسے نئے ممبر کو قبول نہیں کرتیں جو کچھ دنوں باقاعدہ اپرنٹس شپ نہ کرے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسی مزدور سبھائیں، دستکاروں کی جماعت ہیں اگر یہی بات ہے تو ان تمام ادعاؤں کے باوجود، انگریز مزدور جاگ رہے ہیں۔ انگلستان کی تمام چیزوں کی مانند ان کی رفتار بھی دھیمی ہے۔ قدم بھی پھونک پھونک کر اٹھتے ہیں۔ ہچکچاہٹ بھی ہے اور کسی حد تک ناکام کوششیں بھی جاری ہیں۔ کبھی سوشلزم کی طرف سے شبہات بھی کئے جاتے ہیں۔ لیکن وہ آہستہ آہستہ سوشلزم کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں اور یہ نئی تحریک مزدور طبقے کی تمام پرانی جماعتوں میں سرایت کرتی جا رہی ہے۔ اس نے لندن کے بے ہنر مزدوروں کو بھی خواب غفلت سے جگا دیا ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ اس نے خصوصاً اس تحریک کو کتنی تقویت پہنچائی ہے۔ اور اگر تحریک کی رفتار بعض بے صبروں کی توقعات کے مطابق نہیں ہے تو انھیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ مزدور طبقہ ہی وہ طبقہ ہے جو انگریزوں کے قومی کردار کی بہترین صفات کو زندہ رکھتا ہے اور اگر انگریزوں کا ایک قدم بھی آگے بڑھ جائے تو عام طور سے وہ پیچھے نہیں ہٹتا۔ اگر چارٹسٹ تحریک میں شریک ہونے والے مزدوروں کے بیٹے سیاسی طور سے نہیں ابھرے تو ان کے پوتے اپنے آباؤ اجداد کا نام روشن کریں گے۔

لیکن یورپ کے مزدور طبقے کی جیت کا انحصار صرف انگلستان ہی پر نہیں۔ اس کے لئے کم از کم انگلستان، فرانس اور جرمنی کے مزدوروں کا اشتراک عمل ضروری ہے۔ فرانس اور جرمنی دونوں مزدوروں کی تحریک انگلستان سے کہیں آگے ہے۔ جرمنی میں تو وہ کامیابی کے دروازے تک پہنچ گئی ہے۔ پچھلے پچیس سال میں اس نے وہاں عدیم المثال ترقی کی ہے۔ اور بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اگر جرمن متوسط طبقے نے اپنی سیاسی نااہلی، بزدلی، بے استقلالی، تنگ بینی اور بے ضابطگی کا ثبوت دیا ہے تو جرمن مزدوروں کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ چار سو برس گزرے کہ یورپ کے سرمایہ داروں کی پہلی شورش جرمنی ہی سے شروع ہوئی تھی اور اگر موجودہ صورت حال کا خاتمہ ہی ہوگا یہ ممکن نہیں کہ یورپ کے مزدوروں کی پہلی جیت بھی جرمنی ہی میں ہو۔

فریڈرک اینگلس۔ ۱۱ جنوری ۱۸۹۲ء

پہلا باب

موجودہ سیاسی دور میں اگر ایک طرف ملکیت والوں اور بے ملکیت والوں، سرمایہ داروں اور اُجرتی مزدوروں میں طبقاتی دشمنی پائی جاتی ہے تو دوسری طرف پیداوار میں انراج کا دَور دَورہ ہے جدید سوشلزم اپنی ماہیت کے اعتبار سے نتیجہ ہے اسی حقیقت کو جان لینے اور تسلیم کر لینے کا ــــ لیکن اصولی طور پر سوشلزم پہلے پہل اٹھارویں صدی کے فرانسیسی فلسفیوں کے نظریوں کی ایک ترقی یافتہ شکل میں ظاہر ہوتا ہے[۴۴] ـ گو سوشلزم کی بنیاد مادی اور معاشی حقائق پر قائم ہے لیکن ہر نئے نظریے کی مانند، ابتدا میں سوشلزم نے بھی اپنے عہد کے مروجہ علوم سے رشتہ جوڑا۔

وہ فرانسیسی جنھوں نے عوام کے دماغوں میں آنے والے انقلاب کے لئے مواد تیار کیا تھا خود بھی بڑے زبردست انقلابی تھے۔ وہ کسی خارجی اقتدار کو نہ مانتے تھے، چنانچہ اُنھوں نے مذہب، نیچرل سائنس، سوسائٹی اور سیاسی اداروں، غرض ہر چیز پر جی کھول کر اعتراض کئے۔ وہ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر کستے۔ اُن کے نزدیک ہر اس چیز کو جو اس معیار پر پوری نہ اُترے، باقی رہنے کا حق نہیں۔ عقل ہی ہر چیز کو ناپنے کا پیمانہ ٹھہری۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ بقول ہیگل[۴۵] دنیا اپنے سر کے بل کھڑی تھی۔ ابتدا میں تو اس کا مفہوم صرف یہی تھا کہ انسان کا دماغ اور اس کے بنائے ہوئے اصول ہی انسان کے تمام اعمال اور حرکات کی بنیاد ہیں۔ لیکن کچھ دن بعد ایک زیادہ وسیع مفہوم عام

---

[۴۴] یہ اشارہ ہے فرانس کے اُن فلسفیوں اور سائنس دانوں کی طرف جن کے نظریے انقلاب فرانس کے موقع پر کام آئے۔ ان فلسفیوں میں والٹیئر، روسو اور دیدرو زیادہ مشہور ہیں۔

[۴۵] ہیگل اپنی کتاب "فلسفۂ تاریخ" میں انقلاب فرانس کے بارے میں یہ خیال ظاہر کرتا ہے۔ باقی صفحہ ۵۶ پر

ہوا۔ وہ یہ تھا کہ اگر کوئی رائے یا حقیقت دماغ کے مرتب کئے ہوئے اُصولوں کے خلاف ہو تو اُسے اُلٹ پلٹ کر اِن اصولوں کے مطابق کر لینا چاہئے۔ چنانچہ اُس وقت کے تمام پُرانے روائتی تصورات کو اور ہر مروّجہ سماج اور طرزِ حکومت کو نامعقول کہہ کر ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا۔ ان فلسفیوں کا خیال تھا کہ اب تک دنیا نے آنکھ بند کر کے صرف تعصبات کی پیروی کی ہے۔ اور ماضی کی ہر چیز صرف ترس اور حقارت کے لائق ہے۔ اب پہلی بار سورج نکلا ہے اور عقل کی بادشاہت ہوئی ہے۔ اور آئندہ سے وہم پرستی، بے انصافی، رُو رعائت اور استبداد کی جگہ ابدی صداقت، ابدی حق و انصاف، قدرتی مساوات اور انسان کے ناقابلِ انتقال حقوق کی حکومت ہو گی۔

لیکن آج ہم جانتے ہیں کہ یہ عقل کی بادشاہت، سرمایہ داری، سرمایہ داروں کی معیاری بادشاہت کے سوا کچھ نہ تھی۔ ابدی عدل، سرمایہ دارانہ عدل کی شکل میں ظاہر ہوا، اور قدرتی مساوات کا تصور، قانون کے روبرو مساوات کے سرمایہ دارانہ تصور سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اور انسانی حقوق کی فہرست میں سرمایہ دارانہ حقِ ملکیت سب سے مقدم ٹھہرا۔ اور عقل کی بادشاہت،

(بسلسلہ صفحہ ۵۵) لوگوں پر یکایک تصوّرِ "خیر" کے تصور کا اثر پڑنے لگا۔ اس تصور کے مقابلہ میں باطل کیا ٹھہرتا۔ "خیر" کے اسی تصور کی روشنی میں ایک دستورِ اساسی بنایا گیا تھا لہٰذا ہر چیز اِس کے مطابق ہونی چاہئے تھی۔ جب سے سورج کائنات کا مرکز بنا اور گردوں نے اُس کے گرد گھومنا شروع کیا، ایسا کبھی نہیں دیکھا گیا تھا کہ انسان اپنے سر کے بل یعنی تصور کے بل کھڑا ہوتا اور زندگی کی حقیقتوں کو اس تصور، اس پرچھائیں کے مطابق بناتا۔ سب سے پہلے انکساغورث نے کہا تھا کہ دنیا پر عقل کی حکومت ہے۔ لیکن اب پہلی بار انسان نے یہ کہا کہ روحانی حقیقتوں پر تصور کی حکومت ہونی چاہئے۔ سورج کی پہلی کرن پھوٹی اور سوچنے والے موجودات (انسان) نے یہ مقدس دن منایا۔ لوگوں میں بڑا جوش تھا۔ ساری دنیا پر معقولیت پسندی چھائی ہوئی تھی۔ گویا دنیاوی اور ملکوتی امور نوں میں اب سمجھوتا ہو چکا تھا۔"

جس کا خاکہ روسو[۴۶] نے اپنی کتاب معاہدۂ عمرانی میں کھینچا تھا سرمایہ داری کی ایک عمومی جمہوریت ہی کی شکل میں نمودار ہو سکی۔ اٹھارویں صدی کے بڑے بڑے مفکر بھی اپنے پیش رؤں کی مانند، اپنے عہد سے آگے کی نہ سوچ سکتے تھے اور نہ زمانے کے کھینچے ہوئے حصار سے باہر نکل سکتے تھے

لیکن جاگیردار اشرافیے اور سرمایہ دار طبقے کی طبقاتی نزاع کے پہلو بہ پہلو جو پوری سماج کی نمائندگی کا دعویٰ کرتا تھا۔ لوٹنے والوں اور لٹنے والوں یعنی کاہل دولت مندوں اور مفلس محنت کشوں کی باہمی نزاع بھی برابر جاری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ داری کے نمایندوں نے اپنے آپ کو کسی مخصوص طبقہ کے بجائے مصیبت کی ماری ہوئی پوری انسانی برادری کا نمایندہ کہا۔ اب آگے چلئے۔ ابتدا ہی سے سرمایہ داروں کو اُس چیز سے سابقہ پڑنے لگا تھا جو ان کی ضد تھی۔ سرمایہ دار بغیر اُجرتی مزدوروں کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور جس نسبت سے قرون وسطیٰ کے شہری تاجر سرمایہ دار بنتے گئے اُسی نسبت سے[۴۷] اُس عہد کے کارخانوں اور دُکانوں میں اور اُن کے باہر کام کرنے والے مزدور بھی پرولتاری بنتے گئے۔ امیروں سے ٹکر لیتے وقت، سرمایہ داروں کا یہ دعویٰ تو بجا تھا کہ وہ اُس عہد کے مزدوروں کے مفاد کی نمایندگی بھی کرتے تھے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ہر بڑی سرمایہ دار تحریک میں اُس طبقے نے جو موجودہ پرولتاری طبقہ کا پیش رو تھا اپنی الگ تحریک بھی چلائی۔ مثلاً جرمنی میں اصلاح دین

---

[۴۶] ژان ژاک روسو (۱۷۱۲ء تا ۱۷۷۸ء) انقلاب فرانس سے پہلے فرانس کے انقلابی سرمایہ داروں کا نمایندہ تھا۔ اس کی تعلیم کے بموجب سماج اور ریاست اصل میں آزاد انسانوں کے باہمی اور رضاکارانہ "معاہدۂ عمرانی" کے ذریعہ وجود میں آئی تھی۔ لیکن کچھ دنوں بعد عدم مساوات پیدا ہو گئی اور آزاد انسانوں کا وہ سماج اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں رہا۔ انسان فطرتاً آزاد اور آپس میں برابر ہیں۔ اس لئے انھیں قانون کی نظر میں بھی مساوی حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔ روسو کا کہنا تھا کہ انسان اگر کوشش کرے تو معاہدۂ عمرانی کی بنا پر سماج میں انسانی آزادی اور برابری کا دور پھر شروع ہو سکتا ہے۔

[۴۷] وہ مزدور طبقہ جس کے پاس محنت کرنے کی قوت کے علاوہ اور کوئی ملکیت یا دولت نہ ہو۔ یہ فرانسیسی زبان کی اصطلاح ہے۔

اور کسانوں کی جنگ، کے زمانے میں تھامس منزر کی تحریکیں اور ۱۶۴۲ء کے انقلاب انگلستان میں لیولرس[۴۸] اور فرانس کے انقلاب عظیم میں بابوف[۴۹] کی تحریکیں۔

اس طبقے نے جس کی نشوونما ابھی تک نہیں ہوئی تھی انقلابی اور مسلح بغاوت کا علم بلند کیا۔ اس کے پہلو بہ پہلو اس سے مناسبت رکھنے والے نظری اثرات بھی نمودار ہونے لگے۔ چنانچہ سولھویں اور سترھویں صدی میں ایک معیاری سماج کے خیالی خاکے بنائے گئے[۵۰] اور اٹھارویں صدی میں مورلی اور میبلی نے پہلے کمیونسٹ اصول مرتب کئے۔ اب مساوات کا مطالبہ صرف سیاسی حقوق تک محدود نہ رہا بلکہ یہ مطالبہ بھی ہونے لگا کہ افراد کے سماجی حالات بھی یکساں ہونے چاہئیں۔ نہ صرف طبقاتی رعایتیں اور طرفداریاں بلکہ طبقاتی امتیازات بھی مٹائے جانے

---

[۴۸] لیولرس۔ کرامویل کے جمہوریت پسند ساتھیوں کی جماعت۔ یہ لوگ ملوکیت کے دشمن تھے انھوں نے چارلس اول کے قتل کے بعد انتہا پسند مطالبات پیش کئے جو "عوام کے معاہدے" کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ تحریک دراصل متوسط طبقے کے انتہا پسندوں کی تحریک تھی جو ۱۶۴۲ء کی حقیقتوں سے بے پروا ہو کر برطانیہ میں ایک قابل مثال جمہوریت قائم کرنا چاہتے تھے۔

[۴۹] بابوف ایک قسم کی کمیونزم کی تعلیم دیا کرتا تھا جس کی بنیاد انسانی برابری کے عقیدے پر تھی۔ بابوف اور اس کے ساتھی خفیہ سازشوں اور بغاوتوں کے ذریعے، چھوٹے چھوٹے کمیونسٹ گروہوں کے بل پر کمیونزم قائم کرنے کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ بابوف کے زمانے میں آج کل کا مزدور طبقہ وجود میں نہیں آیا تھا اور اس وقت کے محنت کشوں کی عوامی طاقت زیادہ ترقی نہیں کرنے پائی تھی۔

[۵۰] یہاں اینگلس ان خیالی سوشلسٹوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ایک سوسائٹی قائم کرنا چاہتے تھے جس میں ذاتی ملکیت کا وجود نہ ہو۔ سولھویں صدی میں تھامس مور نے اپنی کتاب "یوٹوپیا" میں اور سترھویں صدی میں کمپانیلا نے سماج کا ایسا ہی تصور پیش کیا تھا۔

جائیں۔ ایک ایسے کمیونزم[۵۱] کا نقشہ کھینچا گیا جس میں خوشیوں اور مسرتوں کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ تجویز یہ تھی کہ انسان کو رشی اور راہب بنا دیا جائے۔ کہا جاتا تھا کہ لوگوں کو قدیم اسپارٹا[۵۲] والوں کی سی سادہ زندگی گزارنی چاہیے۔ اس کے بعد تین خیالی سوشلسٹوں کا دور آیا۔ (۱) سینٹ سائمن جس پر مزدوروں کے علاوہ، سرمایہ دارانہ رجحانات کا اثر ابھی تک باقی تھا۔ (۲) فوریر۔ اور (۳) اوون جس نے اُس ملک میں جہاں سرمایہ داری طریقہ پیداوار سب سے زیادہ ترقی پا چکا تھا، سرمایہ داروں اور مزدوروں کی نزاع سے متاثر ہو کر، طبقاتی امتیاز کو ختم کرنے کی باقاعدہ تجویزیں تیار کیں اور براہِ راست فرانسیسی مادیت سے ان کا رشتہ جوڑا۔

ان تینوں مفکروں میں ایک بات مشترک ہے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی اس پرولتاریہ کے مفاد کا نمائندہ بن کر سامنے نہیں آتا جسے تاریخی ارتقا نے اس درمیان میں پیدا کر دیا تھا۔ فرانسیسی فلسفیوں کی طرح وہ بھی ابتدا ہی سے کسی ایک طبقے کو نہیں بلکہ پورے بنی نوع انسان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ انھیں کی طرح یہ لوگ بھی عقل اور ابدی انصاف کی بادشاہت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اُن کی یہ خیالی بادشاہت فرانسیسی فلسفیوں کی بادشاہت سے اُتنی ہی

۵۱۔ کمیونزم۔ فرانسیسی زبان کے لفظ کمیون کا مشتق۔ مشترکہ طور پر دولت پیدا کرنے اور پھر ایک ساتھ رہنے سہنے کا قدیم طریقہ جو پرانی قوموں میں اب تک پایا جاتا ہے۔ مارکسزم کی جدید اصطلاح میں کمیونزم سوشلزم کی ترقی یافتہ شکل ہوگی۔ سوشلزم کے عہد میں مشترکہ طور پر دولت پیدا کرنے اور پھر ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پھل ملنے کی وجہ سے پیداوار اتنی بڑھ جائے گی اور سوسائٹی اتنی ترقی کر جائے گی کہ لوگوں کو نہ صرف اُن کی محنت کا پھل ملے گا بلکہ دولت کی تقسیم کا معیار یہ ہوگا کہ ہر شخص کو اس کی ضرورت کی تمام چیزیں ملا کریں گی۔ یہ کمیونزم کا دور ہوگا۔

۵۲۔ اسپارٹا۔ قدیم یونان کا ایک مشہور شہر جہاں ایک زمانے میں لائی کرگس کا قانون رائج تھا۔ یہاں کے لوگ اپنی بہادری، سادگی اور زہد و تقویٰ کے لیے مشہور تھے۔

دور ہے جتنی زمین آسمان سے۔

ہماری ان تینوں سماجی مصلحین کی نظر میں سرمایہ دار دور کی دنیا بھی جو فرانسیسی فلسفیوں کے اُصولوں پر مبنی تھی بالکل نامعقول اور غیر منصفانہ ہے۔ اسی بنا پر وہ اس دنیا کو بھی اُسی ردّی خانہ میں پھینکنا چاہتے ہیں جہاں جاگیرداری نظام اور سماج کے دوسرے پچھلے نظام پھینک دیے گئے ہیں۔ دنیا میں اگر اب تک عقل اور انصاف کی حکومت نہیں قائم ہو سکی تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ لوگوں نے عقل اور انصاف کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا۔ لہٰذا ایک ایسے بلند خیال مفکر کی ضرورت تھی جو سچائی کو سمجھتا۔ ایسے شخص کا ظہور اب ہوا ہے۔ اُن کے نزدیک ایسے شخص کا ظہور اور پھر اُس کا سچائی کی تہ تک پہونچ جانا، کوئی ناگزیر واقعہ نہیں ہے جو تاریخی ارتقا کے سلسلہ کی ایک ضروری کڑی ہو بلکہ صرف ایک خوش گوار حادثہ ہے ــــــ اُن کے خیال میں ایسا شخص آج سے پانچ سو برس پہلے بھی پیدا ہو سکتا تھا جو انسانیت کو پانچ سو برس کی لغزشوں، جنگ وجدال اور مصیبتوں سے بچا لیتا۔

ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ اٹھارویں صدی کے فرانسیسی فلسفی جو انقلاب کے پیش رو تھے عقل کو ہر چیز کی کسوٹی مانتے تھے۔ وہ ایک معقولیت پسند ریاست، ایک معقولیت پسند سماج قائم کرنے کی فکر کرتے۔ اور ہر اُس چیز کو جو ابدی معقولیت کے منافی ہوتی بالکل ختم کر دینا چاہتے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ یہ "ابدی معقولیت" دراصل اٹھارویں صدی کے متوسط طبقے کی عیاری فراست کے سوا کچھ نہ تھی جو اُنھیں دنوں سرمایہ دار بن رہا تھا۔ انقلاب فرانس نے اس معقولیت پسند ریاست اور معقولیت پسند سماج کے خواب کی تعبیر پوری کر دی۔

انقلاب فرانس نے سماج کا جو نیا ڈھانچہ بنایا وہ پچھلے سماج سے زیادہ معقول تھا۔ لیکن لوگوں کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ مکمل معقولیت یہاں بھی موجود نہیں۔ عقلی ریاست کا سفینہ غرقاب ہو گیا۔ روسو نے مساوات عمرانی کا جو خواب دیکھا تھا اُس کی تعبیر یہ نکلی کہ فرانس میں دہشت انگیزی[۵۲] کو رواج ہوا۔

---

[۵۲] ۱۷۹۳ء میں فرانس کی انقلابی حکومت جس نے انقلاب کے دشمنوں کے خلاف دہشت انگیزی سے کام لیا۔

سرمایہ داروں نے جن کو اب اپنی سیاسی اہلیت پر اعتماد نہ رہ گیا تھا۔ اس دہشت انگیزی سے بھاگ کر پہلے ڈائرکٹریٹ (مجلس نظما)[۵۴] کی بے ایمانیوں کے سایہ میں پناہ لی پھر اپنے آپ کو نپولین ثانی کی مطلق العنانیوں کے سپرد کر دیا۔ اُس "ابدی امن" نے جس کا وعدہ کیا گیا تھا فتوحات اور مسلسل جنگ کی شکل اختیار کر لی۔ عقلی سماج کا حشر بھی کچھ بہتر نہ ہوا۔ امیر اور غریب کی نزاع جیسے پیشہ وروں کی انجمنیں اور دوسری مراعات کم کئے رہتی تھیں اور جن کے اثرات کو کلیسا کے خیراتی ادارے کسی حد تک دبائے ہوئے تھے، ان کے بند ہو جانے پر عام خوش حالی کی شکل اختیار کرنے کے بجائے اور زیادہ تیز ہو گئی۔ جس ملکیت کی آزادی کو جاگیرداری نظام کی بندشوں سے نکلنے اور تکمیل پانے کے بعد بڑے سرمایہ داروں اور بڑے زمینداروں کے تجارتی مقابلے سے سابقہ پڑا تو چھوٹے سرمایہ داروں اور مالکوں کے حق میں یہ آزادی صرف اس بات کی آزادی رہ گئی کہ وہ اپنے ملکیت بڑے سرمایہ داروں اور بڑے زمینداروں کے ہاتھ فروخت کر سکیں۔ اور اس طرح جہاں تک چھوٹے سرمایہ داروں اور کاشت کاروں کا تعلق تھا، اُن کے لئے یہ آزادی دراصل "ملکیت سے دست برداری" کی آزادی ہو گئی۔ سرمایہ داری اصول پر صنعت کی ترقی نے مزدوروں کی مفلسی اور پریشانی کو سماج کے وجود کی ایک لازمی شرط بنا دیا۔ اور بقول کارلائل[۵۵] انسان انسان کے باہمی تعلقات کا واحد ذریعہ محض نقد ادائیگی رہ گیا۔ جرائم سال بہ سال بڑھنے لگے جاگیرداری دور کی جو برائیاں شروع میں دن دہاڑے اور کھلم کھلا نظر آتی تھیں آگے چل کر گو بالکل ختم نہ ہوئی تھیں پھر بھی نظروں سے اوجھل ضرور ہو گئی تھیں۔ اب اُن کے بجائے سرمایہ داری دور کی وہ برائیاں جو پہلے چھپ چھپ کر ہوا کرتی تھیں آزادی سے پھیلنے لگیں۔ تجارت پر دغابازی کا غلبہ روز بروز بڑھتا گیا۔ اور انقلابیوں کے نعرۂ اخوت نے تجارتی مقابلے کی جدوجہد میں عیاری اور رقابت کی شکل اختیار کر لی۔ قدیم

---

۵۴ دہشت انگیزوں کے زوال کے بعد ۱۷۹۵ء میں فرانس میں جو حکومت قائم ہوئی اُسے مجلس نظما کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ نپولین نے ۱۷۹۹ء میں اسے ختم کر کے اپنی ذاتی حکومت قائم کی۔

۵۵ کارلائل۔ برطانیہ کے مشہور مصنف جو دیہاتی سوشلزم کا حامی تھا۔

استبداد کی جگہ بدمعاملگی اور تلوار کی جگہ اشرفی کا راج ہوا۔ دوشیزگی پر جاگیرداروں کے بجائے سرمایہ داروں کا تصرف ہونے لگا۔ جرم فروشی اتنی بڑھ گئی کہ اس سے پہلے کبھی سنی بھی نہ گئی تھی۔ شادی کا طریقہ حسبِ معمول رائج رہا اور اُس کے ذریعے سے عیاشی کی پردہ پوشی ہوتی رہی اور زناکاری بھی خوب بڑھی۔

مختصر یہ کہ روشن خیالی کے ان پیغمبروں کے تمام دلکش وعدوں کے باوجود "عقل کی فتح" کے بعد جو سیاسی اور سماجی ادارے قائم ہوئے وہ بڑے دل شکن تھے۔ اب صرف ایسے لوگوں کی کمی تھی جو ان دل شکن مایوسیوں کو قرینے سے ترتیب دیتے۔ سو ایسے لوگ نئی صدی کے شروع ہوتے ہی ظاہر ہونے لگے۔ ۱۸۰۲ء میں سینٹ سائمن نے اپنے مشہور "جینوا کے خطوط" شائع کئے۔ ۱۸۰۸ء میں فوریر کی پہلی کتاب چھپی (گو فوریر نے اپنے نظریہ کا خاکہ ۱۷۹۹ء ہی میں مرتب کر لیا تھا)۔ اور یکم جنوری ۱۸۰۰ء کو رابرٹ اوین نے نیو لنارک کا انتظام اپنے ذمے لیا۔

لیکن اُس وقت تک سرمایہ داری طریقۂ پیداوار اور اس کے ساتھ سرمایہ داروں اور مزدوروں کی باہمی نزاع نے پوری ترقی نہ کی تھی۔ بڑے پیمانے کی صنعت جس کا انگلستان میں ابھی آغاز ہوا تھا فرانس میں اب تک ناپید تھی۔ لیکن بڑے پیمانے کی صنعت ایک طرف تو ایسی نزاعوں کو ہوا دیتی ہے جن کے باعث طریقۂ پیداوار میں انقلابی تبدیلی اور اُس (طریقۂ پیداوار) کی سرمایہ دارانہ نوعیت کا خاتمہ ضروری ہو جاتا ہے (یہ نزاع صرف اُنھیں طبقوں میں نہیں پائی جاتی جو اس صنعت کی پیداوار ہیں — یعنی سرمایہ دار اور مزدور طبقے — بلکہ خود اُن پیداآور قوتوں اور تبادلے کی شکلوں میں بھی پائی جاتی ہے جنھیں جدید صنعت نے پیدا کیا ہے)۔ دوسری طرف (جدید صنعت) خود انھیں زبردست پیداآور قوتوں میں اس نزاع کو ختم کرنے کی صلاحیت بھی پیدا کرتی ہے اور اس صلاحیت کو بڑھاتی ہے۔

۱۸۰۰ء تک نئے سماجی نظام کی نزاعیں پورے طور سے اُبھری نہ تھیں اور نہ ان کا روپ ابھی نکھرا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ان نزاعوں کو ختم کرنے والے ذریعے خرابیاں

اور خامیوں سے کیوں کر پاک ہوتے ۔ دہشت انگیزی کے زمانے میں ، پیرس کے تن کٹے عوام کو تھوڑی دیر کی حکومت مل گئی تھی اور اُنھوں نے سرمایہ داروں کی مرضی کے خلاف سرمایہ داری انقلاب کو کامیاب بنادیا تھا لیکن اُن کے اس طرزِ عمل نے یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ عوام کے لئے اُن حالات میں اپنا اقتدار قائم کرنا کتنا ناممکن تھا ۔ مزدور جماعت میں جو اُن دنوں پہلی بار ان کنگال عوام سے الگ ایک نئے طبقے کی شکل اختیار کر رہی تھی ابھی اس کی اہلیت نہیں پیدا ہو ئی تھی کہ وہ اپنی آزاد سیاسی تحریک کو کامیاب بنا سکے ۔ ابھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی مصیبت زدہ جماعت ہے جس میں اپنی مدد کرنے کی اہلیت نہیں اور جو دوسروں کی مدد کی محتاج ہے ۔

سوشلزم کے بانی بھی اس تاریخی حقیقت اور اُس کے اثرات سے بچ نہ سکتے تھے چنانچہ اُن کے بنائے ہوئے سوشلزم کے نظریوں میں بھی وہی خامی اور نقص موجود ہے جو اُس وقت تک سرمایہ دارانہ پیداوار اور طبقات کی حیثیت میں پایا جاتا تھا ۔ معاشی حالات نے ابھی تک پوری ترقی نہ کی تھی اور سماجی مسائل کے حل ابھی تک ان کے بطن میں پوشیدہ تھے ۔ سوشلزم کے بانیوں نے ان کا حل نکالنے میں اپنی ذہنی اُپج سے کام لیا ۔ سماج میں ہر طرف بُرائیاں ہی بُرائیاں ہیں اور عقل کا کام ان برائیوں کو دُور کرنا ہے ۔ لہٰذا ضرورت صرف یہ ہے کہ سماج کے لئے ایک نیا اور مکمل نظام تیار کیا جائے ۔ پھر اسے پروپگنڈا کے ذریعے سماج کے سر تھوپا جائے اور جہاں کہیں ممکن ہو اس کے مطابق تجربے کئے جائیں تاکہ لوگ ان نمونوں کو دیکھنے کے بعد اس نظام کی اچھائی کے قائل ہو جائیں ۔ لیکن سماجی نظام کے ان خاکوں کی حیثیت شیخ چلی کے منصوبوں سے زیادہ نہ تھی ۔ خیالی سوشلسٹ ان نئے خاکوں میں تفصیلات کا جتنا رنگ بھرتے گئے ، اُن کے خاکے اُتنے ہی زیادہ خیالی ہوتے گئے ۔

سینٹ سائمن انقلاب فرانس کی پیداوار تھا ۔ انقلاب کے وقت اُس کی عمر تیس سال سے بھی کم تھی ۔ انقلاب میں "تیسری جماعت" یعنی عوام کی جیت ہوئی تھی ۔ وہی عوام جو

دولت پیدا کرتے ہیں اور تجارت میں مصروف رہتے تھے ۔ اور جاگیرداروں اور پادریوں کی ہوتی تھی جو کاہل اور نکمّے تھے اور مراعات پر جیتے تھے ۔ لیکن یہ حقیقت جلد ہی روشن ہو گئی کہ یہ جمعیت تمام باشندوں کی مجموعی جمعیت نہیں تھی بلکہ اُس کے ایک چھوٹے سے جز ــــ یعنی صاحب املاک سرمایہ داروں ــــ کی جمعیت تھی ۔ انقلاب کے زمانے میں سرمایہ داروں نے کلیسا اور نوابوں کی جائدادوں پر ، جو ضبط ہونے کے بعد بکنے کے لئے بازار میں آئیں ، سٹہ کھیل کر اور فوجی ٹھیکوں میں قوم کو لوٹ کر خوب ترقی کی ۔ ڈائرکٹری کے عہد میں انہیں دغابازوں کے اقتدار کی بدولت فرانس کو تباہی کا منہ دیکھنا پڑا اور نپولین کو اچانک حکومت پر قبضہ کر لینے کا بہانہ ہاتھ آیا ۔

یہی وجہ ہے کہ سینٹ سائمن کی نظر میں عوام اور برسرِ اقتدار طبقوں کی نزاع دراصل "کام کرنے والوں" اور کاہلوں کی نزاع قرار پائی ۔ اُس نے صرف پُرانے برگزیدہ طبقوں ہی کو کاہلوں میں نہیں شمار کیا بلکہ وہ سب لوگ جو پیداوار یا تقسیم پیداوار میں حصہ لئے بغیر اپنی بے کمائی ہوئی آمدنی پر جیتے تھے اُس کے نزدیک کاہل ٹھہرے ۔ اسی طرح نہ صرف اُجرتی مزدور بلکہ سوداگر ، تاجر اور بینکر بھی " کام کرنے والوں میں " شمار کئے جانے لگے ۔ یہ بات تو پہلے ہی ثابت ہو چکی تھی کہ اس کاہل طبقے میں اب سماج کی ذہنی رہنمائی اور سیاسی اقتدار کی اہلیت باقی نہیں لیکن انقلاب فرانس نے اس تجربت پر تصدیق کی آخری مہر لگا دی ۔ البتہ سینٹ سائمن کا خیال تھا کہ دہشت انگیز حکومت کے تجربوں نے یہ ثابت کر دیا کہ بے ملکیت والے طبقوں میں بھی اس کی اہلیت نہیں ۔ پھر ایسی حالت میں کون سالار کارواں بنے اور سماج پر کس کی حکومت ہو سینٹ سائمن کی رائے تھی کہ سائنس اور صنعت کو ایک ہی مذہب کی لڑی میں پرو دیا جائے تاکہ مذہبی خیالات کا وہ اتحاد دوبارہ قائم ہو جائے جو اصلاح دین کے بعد سے ناپید تھا ۔ جدید مسیحیت کی یہ ایک موہومانہ تاویل تھی ۔ لیکن سائنس عبارت تھی پڑھے لکھے عالموں سے اور صنعت عبارت تھی محنت کرنے والے سرمایہ داروں ، تاجروں ، بینکروں اور کارخانہ داروں سے ۔ سینٹ سائمن کی خواہش تھی کہ سرمایہ دار اپنے آپ کو پبلک کا خادم اور سماج کا امین و محافظ سمجھیں البتہ انھیں اس کی اجازت

تھی کہ مزدوروں کے مقابلے میں حاکمانہ حیثیت رکھیں اور معاشی اعتبار سے انھیں زیادہ رعایتیں حاصل ہوں۔ خصوصاً بینکروں کا یہ کام تھا کہ قرضوں کا مناسب انتظام کرکے پوری سماجی پیداوار کی نگرانی اپنے ذمہ لیں۔ یہ تصور اُس عہد کے بالکل مطابق تھا۔ فرانس کی جدید صنعت اور اُسی کے ساتھ سرمایہ داروں اور مزدوروں کے اختلافات کی ابھی ابتدا ہی تھی۔ لیکن سینٹ سائمن جس بات پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے وہ یہ ہے کہ اُسے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ جس چیز سے دلچسپی ہے وہ اس طبقے کی قسمت ہے جو تعداد میں سب سے زیادہ ہے اور جس کی مالی حالت سب سے زیادہ خراب ہے۔

سینٹ سائمن نے یہ دعویٰ کہ "ہر شخص کو کام کرنا چاہیے" اپنی کتاب "خطوط جنیوا" ہی میں پیش کر دیا تھا۔ لیکن وہ بن ملکیت والے عوام کو حکومت کا اہل نہیں سمجھتا۔ اس کتاب کے لکھنے سے پہلے ہی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ دہشت انگیز حکومت بن ملکیت والوں کی حکومت تھی۔ اسی لئے وہ ان سے خطاب کرکے کہتا ہے: "دیکھو اور آنکھیں کھول کر دیکھو کہ تمھارے رفیقوں کی حکومت کے زمانے میں فرانس پر کیا گزری۔ اُنھوں نے ملک میں قحط برپا کر دیا۔" سینٹ سائمن کا یہ خیال کہ انقلاب فرانس ایک طبقاتی جنگ ہے اور اس میں صرف نواب اور سرمایہ داری نہیں بلکہ نواب، سرمایہ دار اور بن ملکیت والے عوام بھی شامل ہیں، ۱۸۰۲ء کے لئے ایک غیر معمولی انکشاف تھا۔ ۱۸۱۴ء میں سائمن نے لکھا کہ سیاست نام ہے پیداوار کے سائنس کو جاننے کا۔ اور یہ پیشین گوئی کہ سیاست آگے چل کر معاشیات میں ضم ہو جائے گی۔ سینٹ سائمن کی یہ پیشین گوئی اس کی دُور بینی اور ترقی پسندی پر دلالت کرتی ہے۔ یہیں سے یہ خیال بھی بڑھنے لگتا ہے کہ سیاسی اداروں کی بنیاد معاشی حالات پر ہے۔ گو یہ خیال ابھی ناقص شکل میں پیدا ہوا ہے لیکن اس سے جو چیز صاف ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آگے چل کر لوگوں پر سیاسی حکومت کرنے کے بجائے پیداوار کی نگرانی اور اشیا کی دیکھ بھال کی جانے لگے گی" یعنی ریاست منسوخ ہو جائے گی۔"

سینٹ سائمن، ۱۸۱۴ء میں اُس وقت جب کہ اتحادی فوجیں پیرس میں داخل ہو رہی تھیں اور پھر ۱۸۱۵ء میں "سو دن" کی لڑائی کے موقع پر اپنے ہم عصروں پر سبقت لے گیا۔

اُس نے اعلان کیا کہ یورپ کے امن ترقی اور خوش حالی کا انحصار فرانس، انگلستان اور جرمنی کے باہمی اتحاد پر ہے۔ بعد ۱۸۱۵ء میں فرانس کو یہ مشورہ دینے کے لئے کہ وہ واٹرلو[۵۶] کے فاتحین سے مل جائے بڑی ہمت اور تاریخی دُور اندیشی کی ضرورت تھی۔

سینٹ سائمن کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی دُور بینی اور نظر کی وسعت تھی۔ چنانچہ اس کی تصنیفات میں بعد کے سوشلسٹوں کے ان تمام خیالات کا ایک دُھندلا سا خاکہ مل جاتا ہے جو اپنی نوعیت میں خالص سماجی خیالات نہیں کہے جا سکتے۔

فوریر کی تعلیمات میں ہمیں موجودہ سماجی حالات کی ایسی تنقید ملتی ہے، جو اپنی خالص فرانسیسی ظرافت کے باوجود، نکتہ رسی میں بھی کسی طرح کم نہیں۔ فوریر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ موجودہ سماج پر تنقید کرتے وقت سرمایہ داروں کو خواہ وہ انقلاب فرانس سے پہلے کے مفکرین ہوں یا انقلاب کے بعد کے سرمایہ داری کی کاسہ لیسی کرنے والے خود غرض لوگ ہوں، دُشمن کا پکا مان لیتا ہے۔ اور پھر سماج کے اس مادی افلاس کو بے نقاب کر دیتا جس پر سرمایہ داروں نے اپنے جھوٹے دعووں کی ایک رنگین چادر ڈال رکھی تھی۔ پھر انقلاب سے پہلے کے فلسفیوں کے اُن سُنہرے وعدوں کی یاد دلاتا ہے جن میں ایک ایسے سماج کا نقشہ کھینچا گیا تھا جہاں صرف عقل کی حکومت ہو گی، گھر گھر خوشی کے چراغ جلتے ہوں گے، اور انسان ہر اعتبار سے مکمل ہو گا۔ وہ اپنے عہد کے اُن فلسفیوں کے خواب کے محل پر بھی ضرب لگا دیتا ہے جو سرمایہ داری کی حمایت کرتے رہتے تھے، وہ بتاتا ہے کہ ان کھوکھلی لفاظیوں کی آغوش میں کیسی کیسی دردناک حقیقتیں پڑی

---

[۵۶] واٹرلو کی لڑائی میں نپولین بوناپارٹ اول شہنشاہِ فرانس کو انگریزوں کے مقابلے میں سخت اور فیصلہ کن شکست ہوئی ...... اور تخت و تاج سے ہمیشہ کے لئے دستبردار ہونا پڑا۔ انگریزوں کی مدد پر زار روس، پروشیا (یعنی جرمنی) اور آسٹریا کی فوجیں بھی جنگ میں شریک تھیں، واٹرلو کی شکست کے بعد فرانس میں دوبارہ بادشاہت قائم ہوئی اور لوئی ہژدہم سنہ ۱۸۱۴ء میں فرانس کا بادشاہ ہوا۔

کراہ رہی ہیں۔ اُس کے فقروں کا طنز اور اس کے لہجے کی تلخی فلسفیوں کی میٹھی میٹھی باتوں کو بالکل مضحکہ خیز بنا دیتی ہے۔

فوریئر صرف نقاد ہی نہیں بلکہ اپنی منجملہ فطرت کے بدولت دنیا کے چوٹی کے طنز نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔ انقلاب فرانس کے زوال پر شہ بازی اور دغا بازی کا جو بازار گرم ہوا اور تجارت اور دکانداری کی جو ذہنیت پھیلی، فوریئر نے اُس کی بڑی سچی اور دلکش تصویر کھینچی ہے۔ سرمایہ داری سماج میں سرمایہ داروں کے جنسی تعلقات اور عورت کی سماجی حیثیت کا نقشہ کھینچنے میں تو اُس نے کمال کر دیا ہے۔ فوریئر ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ اعلان کیا کہ ہر سماج میں عورت کی آزادی، سماجی آزادی کی سچی کسوٹی ہے۔

سماجی تاریخ کے متعلق اپنا تصور پیش کرتے وقت فوریئر کا قلم اپنی ذہنی رفعت کی آخری منزلیں طے کرنے لگتا ہے۔ وہ سماج کے پورے ارتقا کو چار دور میں تقسیم کرتا ہے۔ پہلا دور وحشت کا ہے دوسرا بربریت کا تیسرا سرقبیلی نظام کا اور چوتھا تہذیب کا۔ یہ چوتھا دور وہی ہے جسے آج کل سرمایہ دارانہ دور کہتے ہیں۔ یہ سماجی نظام سولھویں صدی کی ابتدا میں وجود میں آیا۔ وہ ثابت کرتا ہے کہ اس مہذب دور نے ہر اُس برائی کو جو بربریت کے دور میں سادہ شکل میں رائج تھی، پیچیدہ، مبہم اور منافقانہ رنگ میں رنگ دیا۔ پوری سرمایہ دارانہ تہذیب ایک بھنور کی صورت میں حرکت کرتی ہے اور اپنے تضاد کو بلا اُن کا کوئی حل پیش کئے سرے سے زندہ کرتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی منزل مقصود یعنی اُس منزل پر پہنچنے کے بجائے جس تک پہنچنے کا وہ جھوٹا دعویٰ کرتی ہے، برابر اُسی مقام پر پہنچتی رہتی ہے جو اس منزل مقصود کی ضد ہے۔ اس تہذیب کے دور میں افراط کے پیٹ سے مفلسی پیدا ہوتی ہے۔"

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فوریئر جدلیات کے استعمال میں وہ کمال دکھاتا ہے جو اُس کے ہم عصر ہیگل کا حصہ ہے۔ اسی اصول کے بل پر وہ "تکمیل انسانی" کی مخالفت کرتا اور یہ دعویٰ پیش کرتا ہے کہ ہر تاریخی عہد کا ایک دور ترقی اور ایک دور انحطاط ہوتا ہے۔ اسی

دعویٰ کی روشنی میں وہ نسلِ انسانی کے مستقبل پر بھی یہی حکم لگاتا ہے جس طرح کانت نے طبعی سائنس کے ضمن میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ کرۂ زمین کا انجام فنا ہے، اُسی طرح فوریئر نے بھی علم تاریخ کے ضمن میں، نسلِ انسانی کا انجام فنا قرار دیا۔

فرانس میں انقلاب کی ایک زبردست لہر اُٹھی اور سارے ملک پر چھا گئی۔ انگلستان میں ہرچند انقلاب خاموشی سے ہو رہا تھا لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ اس کی قوت میں یہاں کوئی کمی تھی۔ بھاپ اور نئی آلہ ساز مشینیں کارخانہ داری کو جدید صنعت کے سانچے میں ڈھال رہی تھیں اور اس طرح سرمایہ داری سماج کی پوری بنیاد میں انقلابی تبدیلی ہو رہی تھی۔ کارخانہ داری کے دور کی سست رفتار ترقی کی جگہ پیداوار میں طوفان و ہنگامے کا دور شروع ہو چکا تھا۔ پیداوار میں سُرعت پیدا ہوئی تو سماج بڑے بڑے سرمایہ داروں اور بن ملکیت والے مزدوروں میں بٹنے لگی۔ اور پچھلے دور کے متوسط طبقے کی جگہ جس کی بنیادیں کافی مضبوط تھیں، دست کار اور چھوٹے چھوٹے دکان دار لینے لگے جن کی تعداد ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہتی تھی اور جو بڑی ڈانواں ڈول زندگی گزارتے تھے۔

پیداوار کا یہ نیا طریقہ ابھی ترقی کی ابتدائی منزلوں میں تھا۔ ابھی اس میں کوئی غیر معمولی بات پیدا نہیں ہوئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن حالات میں کوئی دوسرا طریقہ ممکن ہی نہ تھا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس طریقہ پیداوار کی بدولت اُس وقت بھی بڑی تکلیف دہ سماجی خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ مثلاً بڑے بڑے شہروں میں بہت سے بے گھر والوں کو مویشیوں کی طرح شہر کے سب سے خراب حصوں میں رہنا پڑتا تھا۔ سارے قدیم نسلی رشتے ٹوٹنے لگے تھے۔ والدین کی اطاعت اور خاندانی تعلقات کی گرفت ڈھیلی ہو گئی تھی۔ مزدوروں خاص کر عورتوں اور بچوں سے سخت محنت لی جاتی تھی

مزدور طبقے کو بالکل نئے ماحول سے آشنا کیا گیا اور پھر کس مپرسی کے عالم میں چھوڑ دیا گیا۔ وہ دیہات سے شہروں میں لائے گئے۔ زراعت سے نکال کر جدید صنعت میں کھپائے گئے، اور انھیں ایسے حالاتِ زندگی کے بجائے جو ایک حد تک پائدار تھے ایسے ناپائدار حالات

میں زندگی گزارنی پڑی جو ہر دم بدلتے رہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مزدور طبقہ کا نہ کوئی اخلاق رہ گیا اور نہ کوئی کردار۔

اسی موقع پر ایک نوجوان مُصلح پیدا ہوا جس کی عمر صرف ۲۹ سال تھی۔ اُس کا نام رابرٹ اوون تھا۔ اوون ایک کارخانہ دار تھا۔ اُس کے کردار میں بڑی معصومیت اور فطرت میں بڑی سادگی تھی۔ اوون دراصل فطرتاً ایک رہنما تھا۔ وہ مادہ پرست فلسفیوں کی تعلیمات قبول کر چکا تھا اور یہ مانتا تھا کہ انسان کا کردار بعض موروثی خصوصیتوں اور انسان کے اپنے ماحول کی پیداوار ہے، خصوص کر اُس ماحول کی جس میں اس کی ابتدائی نشوونما ہوئی ہو۔ اُس کے طبقے کے اکثر لوگوں کو (کارخانہ داروں) صنعتی انقلاب میں ابتری اور انتشار کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اُن کے نزدیک یہ انتشار، فائدہ اُٹھانے اور قسمت بنانے کا بہترین موقع تھا۔ لیکن اُن کے برعکس رابرٹ اوون نے اس موقع پر اپنے محبوب نظریے کو عمل میں لانا اور انتشار میں ترتیب پیدا کرنا ہی زیادہ مناسب سمجھا۔ اُس نے مانچسٹر کے ایک کارخانہ میں اپنے نظریے کو پانچ سو مزدوروں کی جماعت پر آزمایا تھا اور اس تجربے میں اُسے کامیابی بھی ہوئی تھی۔ چنانچہ اُس نے سنہ ۱۸۰۰ء سے سنہ ۱۸۲۹ء تک اسکاٹ لینڈ میں نیو لنارک کے مقام پر روئی کا ایک کارخانہ اسی اصول پر چلایا۔ اس کارخانہ میں اُس کا اپنا بڑا حصہ تھا اور منتظم کی حیثیت سے وہاں عمل کی آزادی بھی سب سے زیادہ تھی۔ اس اسکیم کی کامیابی نے اُسے پورے یورپ میں مشہور کر دیا۔ اس کارخانہ میں جس کی آبادی بڑھتے بڑھتے ڈھائی ہزار ہو گئی تھی، ابتدا میں رنگ برنگ کے لوگ شامل تھے۔ ان میں سے اکثروں کی اخلاقی حالت بہت گری ہوئی تھی۔ اوون نے اس نوآبادی کو سماجی زندگی کا ایک ایسا جیتا جاگتا نمونہ بنا دیا جس میں شراب نوشی، پولیس، عدالت، مجسٹریٹ، مقدمہ، قانون مساکین کے تحت امدادی اداروں اور خیرات وغیرہ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ سماجی زندگی کو اس قابل مثال منزل تک لانے کے لئے اوون نے یہ کوشش کی کہ لوگوں کو ایسی زندگی بسر کرنے کا موقع دیا جائے جو انسان کے شایانِ شان کہی جا سکے۔ اُس نے اس نوآبادی کی نئی نسل کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ کی۔

چنانچہ بچوں کے سب سے پہلے مدرسے کا بانی بھی رابرٹ اوون ہی ہے۔ اس نے جدید قسم کے یہ مدرسے سب سے پہلے نیو لنارک میں قائم کئے۔ بچوں کو دو سال کی عمر میں مدرسے بھیج دیا جاتا۔ وہاں اُن کی دلچسپی کے اتنے سامان فراہم کئے جاتے اور انھیں وہاں اتنا لطف آتا کہ وہ گھر جانے کا نام بھی نہ لیتے۔ سرمایہ داروں کے کارخانوں میں مزدوروں کو روزانہ تیرہ چودہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا لیکن نیو لنارک میں محنت کے اوقات صرف ساڑھے دس گھنٹے تھے۔ ایک بار کپاس کی منڈی میں گڑبڑ مچی تو نیو لنارک کا کارخانہ چار مہینہ تک بند رہا اس کے باوجود وہاں کے مزدوروں کو برابر پوری اجرت ملتی رہی۔ لیکن ان سہولتوں سے کاروبار اور نفع کو نقصان نہ پہونچا بلکہ کاروبار دُگنا بڑھ گیا اور کارخانہ کے مالکوں کو آخر وقت تک خوب نفع ہوتا رہا۔

لیکن رابرٹ اوون مطمئن نہ تھا۔ یہ سہولتیں ابھی اُس کے معیار سے کم تھیں۔ اور انسانی زندگی کے ہرگز شایانِ شان نہ تھیں۔ نیو لنارک کی نو آبادی میں بسنے والے مزدوروں کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے اوون نے لکھا کہ "یہ لوگ غلام ہیں اور ان کی ساری زندگی ابھی تک میرے رحم و کرم پر ہے۔" اُس نے مزدوروں کے لئے نسبتاً بہتر حالات پیدا کر دئے تھے لیکن ابھی تک کوئی ایسی صورتِ حال پیدا نہیں ہوئی تھی کہ لوگوں کے ذہن اور کردار معقول طور پر ترقی کرتے۔ انسان کی نجی صلاحیتوں کی بے روک ٹوک نشوونما کے مواقع تو اور بھی کم تھے۔ "پھر بھی ڈھائی ہزار کی یہ بستی سماج کے لئے روزانہ اُتنی ہی دولت پیدا کرتی ہے جتنی اب سے پچاس سال پہلے چھ لاکھ آدمیوں کی بستی پیدا کرتی تھی۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا ڈھائی ہزار اور چھ لاکھ آدمیوں کے استعمال میں آنے والی دولت کا فرق کیا ہو گیا؟"

اس کا جواب صاف تھا۔ اسی فرق میں سے، کارخانے میں روپیہ لگانے والے سرمایہ داروں کو پانچ فی صدی کے حساب سے سود ادا کیا گیا، تین لاکھ پونڈ منافع اس پر مستزاد۔ پھر جب نیو لنارک کا یہ حال تھا تو انگلستان کے دوسرے صنعتی کارخانوں کا کیا پوچھنا اگر مشین کے ذریعے یہ نئی دولت

---

* "خیال اور عمل کا انقلاب" از اوون۔ یہ یادداشت اوون نے ۱۸۱۳ء میں برطانیہ اور فرانس کی حکومتوں اور کیونسٹوں اور سوشلسٹوں کے پاس بھیجی تھی۔

نہ پیدا کی جاتی تو برطانیہ کو اُن یورپین جنگوں میں ہرگز کامیابی نہ ہوتی جو نپولین کی مخالفت اور سماج کے اشرافی اُصولوں کی حمایت میں لڑی گئی تھیں۔ یہ نئی قوت علاوہ مزدوروں کے اور کس کی پیدا کی ہوئی تھی؟ لہٰذا اس قوت کا پھل بھی اُنھیں کو ملنا چاہیے تھا۔ اِن فولاد اور عظیم الشان پیداآور قوتوں نے جن سے اب تک صرف افراد نے مالی فائدہ اٹھایا تھا اور عوام کو اپنا غلام بنایا تھا، رابرٹ اوون کو ایک نئے سماجی نظام کی تعمیر کا راز بتایا ـــــ ایسا سماجی نظام جس میں یہ پیداآور قوتیں سماج کی پنچائتی ملکیت ہوں جس سے سب کو فائدہ پہونچے۔

غرضیکہ رابرٹ اوون کی کمیونزم کی ابتدا خالص کاروباری طریقے سے ہوئی تھی۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ وہ کاروباری حساب کتاب کا نتیجہ تھی۔ چنانچہ اس کی یہ عملی خصوصیت برابر باقی رہی۔ ۱۸۲۳ء میں اوون نے آئرلینڈ کے لوگوں کی مصیبت دُور کرنے کے لئے کمیونسٹ نوآبادیوں کی جو اسکیم بنائی اُس میں بھی کمیونسٹ نوآبادیاں قائم کرنے کے مصارف، سالانہ اخراجات اور آمدنی کا ایک مکمل خاکہ موجود تھا۔ اوون نے مستقبل کے لئے جو لائحہ عمل بنائے ہیں اُن میں بھی فنی تفصیلات کو اس لیاقت سے ترتیب دیا گیا ہے ـــــ اور ان کے تمام پہلوؤں کو اتنے مکمل طریقہ پر واضح کیا گیا ہے ـــــ کہ اگر سماجی اصلاح کے اوونی طریقہ کو مان لیا جائے تو عملی نقطہ نظر سے اصل تفصیلات سے کوئی اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔

اوون کمیونزم کی سمت بڑھا تو اُس کی زندگی نے ایک نیا رُخ بدلا۔ جب تک وہ صرف بنی نوع انسان کا ہمدرد بنا رہا اُس کی تعریفیں ہوتی رہیں، اُس کے گُن گائے گئے، اُس کی عزت کی گئی اور اُس پر دولت کی بوچھار ہوتی رہی۔ وہ یورپ کا سب سے معقول آدمی سمجھا جاتا تھا۔ نہ صرف اُس کے طبقہ کے لوگ بلکہ سیاست داں اور ولیانِ ملک بھی اُس کو اچھی نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن اُس کے کمیونسٹ نظریوں کی بات ہی اَور تھی۔ ان نظریوں کے مطابق سماجی اصلاح کی راہ میں تین بڑی رکاوٹیں تھیں (۱) ذاتی ملکیت (۲) مذہب (۳) اور شادی کا موجودہ طریقہ ـــ وہ جانتا تھا کہ ان تینوں چیزوں کی مخالفت کرنے کا انجام کیا ہوگا ـــ سرکاری

طبقوں سے اختیارات [illegible] اور حیثیت کا خاتمہ [illegible] اور حکومت کی تنظیم [illegible]
ذات سے [illegible] کوئی [illegible] ہو سکے گی۔ [illegible] اس نے [illegible] سے پہلے پیدا
ہو کر [illegible] کی مخالفت شروع کر دی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ [illegible] نے اسے [illegible] اور اخباروں نے
اس کا [illegible] ہے اُس کے خلاف [illegible] ہو۔ اس
کے [illegible] اس نے اپنی ساری دولت لگا دی تھی [illegible] ناکام رہے۔
[illegible] مزدوروں کی [illegible] تیس سال [illegible] میں کام کرتا رہا۔ انگلستان کی [illegible]
تحریک اور [illegible] کے مزدوروں کی تمام [illegible] اووین کی [illegible]
پانچ سال کی [illegible] کے بعد اس نے [illegible] میں [illegible] اس بات [illegible] کیا
کہ [illegible] کام کرنے والے [illegible] اور [illegible] کے [illegible] محنت کی [illegible]
اپنی [illegible] اووین [illegible] انگلستان کی [illegible]
کی تمام [illegible] مزدوروں کی ایک [illegible] قائم کی گئی تھی۔ تیس سے [illegible]
[illegible] تمام [illegible] کرنے والوں اور [illegible] پیدا کرنے والوں [illegible] کے
نے [illegible] سوسائٹیاں [illegible] قائم کیں۔ ان سوسائٹیوں نے [illegible]
[illegible] کرنے کے لئے [illegible] کی ضرورت نہیں۔ اووین نے
مزدوروں کی [illegible] کے لئے [illegible] بازار قائم کئے۔ [illegible]
[illegible] ایک گھنٹہ کی محنت [illegible] مزدوروں کی
[illegible] اووین نے [illegible] کے [illegible] پیش کی۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

البتہ اوون کی تجویز پُرودھان کی تجویز سے اس معنی میں بالکل مختلف تھی کہ اوون نے پُرودھان کی طرح یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ اُس کی تجویز ہر سماجی روگ کے لئے اَکسیر ہے۔ اوون تو صرف یہ کہتا تھا کہ اگر اُس کی تجویز پر عمل کیا گیا تو سماج میں زیادہ بنیادی تبدیلیوں کے لئے راستہ صاف ہو جائے گا۔

ان خیالی سوشلسٹوں کے نظریے اُنیسویں صدی کے سوشلسٹ خیالات پر بہت دن تک چھائے رہے اور اب بھی تھوڑا بہت اثر ضرور رکھتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک فرانس اور انگلستان کے تمام سوشلسٹ اِنھیں کے معتقد تھے۔ جرمنی کی ابتدائی کمیونزم بھی جس میں ویٹلنگ[۵۸] کی کمیونزم شامل ہے اسی قسم کی تھی۔ ان سبھوں کی نظر میں سوشلزم عبارت تھی سچائی، عقلیت اور انصاف پسندی سے۔ اُن کا خیال تھا کہ سوشلزم میں خود اتنی طاقت (اخلاقی قوت) ہے کہ رواج پاتے ہی وہ ساری دُنیا کو فتح کر لے گا۔ جس طرح ابدی سچائی زمان و مکان کی پابندیوں سے آزاد ہے اور حکم لگاتے وقت یہ نہیں سوچتی کہ انسان نے سماجی ترقی کے کتنے زینے طے کئے ہیں، اُسی طرح سوشلزم کا ظہور بھی "کب" اور "کہاں" کے جھگڑوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ تو ایک

(بسلسلہ صفحہ ۷۲) جس کی بنیاد چھوٹے چھوٹے کسانوں اور آزاد پیداکنندوں کی اپنی آزاد محنت پر ہو۔ کوئی کسی دوسرے سے اُجرت پر کام نہ لے۔ اس کے سماج میں چھوٹے پیمانے پر انفرادی ملکیت کی گنجائش بھی تھی۔ اس کے بینک آف ایکسچینج کا مقصد بھی یہی تھا کہ اس کے ذریعے چھوٹے چھوٹے "پیداکنندے" برابر محنت کے لئے برابر محنت کی بنیاد پر اپنی اپنی پیداوار کا تبادلہ کریں۔

۵۸ ولیم ویٹلنگ۔ (۱۸۰۸ء تا ۱۸۷۱ء) جرمنی کا پہلا سوشلسٹ اہلِ قلم جو خود مزدور تھا۔ مزدور ہونے کی وجہ سے وہ یہ تو جانتا تھا کہ بلا جد و جہد کے مزدور طبقہ اختیار نہیں حاصل کر سکتا لیکن اس کے باوجود وہ خیالی سوشلزم کے اثرات سے آزاد نہ ہو سکا۔ اُس نے اپنے نظریے میں خیالی سوشلسٹوں کے نظریے اور مزدور طبقے کی انقلابی جد و جہد دونوں کو ملانا چاہا۔ وہ مساوات کا مطالبہ کرتا تھا اور سرمایہ دارانہ نظام پر اخلاقی اُصولوں کے تحت اعتراض کرتا تھا۔

معلوم ہے جو زمان و مکان اور سماجی حالات کی پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے۔ اسی موہوم خیالی کے جواز و خیالی سوشلزم کے مختلف بانیوں کی تجویز کی ہوئی سوسائٹی اور انصاف پسندی کا تصور ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا تصور اُن کی اپنی کے حالات زندگی، معلومات اور ذہنی تعلیم و استطاعت کے ماتحت تشکیل پاتا ہیں۔ اس اختلاف ہونا بھی لازمی تھا اور مادی مجبوریوں کے اس اختلاف کا ایک ہی حل تھا وہ یہ کہ وہ ایک دوسرے سے عمر اکثریت مایوس ہو جاتے ہیں۔ اس سے بجز اس کے اور کوئی نتیجہ نکلا کہ سوشلزم کی ایک سماجی اور پولیٹکل شکل پیدا ہو گئی جو اب تک فرانس اور انگلستان کے انگریز سوشلسٹوں کے دماغ پر طاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ایسے گروہوں میں عجیب و غریب خیال کے لوگ پائے جاتے تھے۔ "خیالی سوشلزم" کے تصور سے متاثر ہو کر وہ جماعتیں بنتیں اُن کے بانی صرف مری تقریر پیش کرتے اور وہی تنقیدی بیانات شائع کرتے اور انسانی مستقبل کی صرف ایسی ہی تصویر پیش کرتے اور یہ ظاہر کرتے کہ بتانے میں ہی باہمی اختلافات اور اعتراض کی گنجائش سب سے کم ہو۔ یہ سوشلزم تحریک بلکہ پہلے پہل کا تجربہ تھا اس تحریک کی شدید ضرورت محسوس کی گئی اور اس کے اجزائے ترکیبی میں جتنا اضافہ ہوتا گیا یہ جس قدر اپنی اندرونی قوت اور بیرونی اشکال زیادہ کرنے لگے۔ چلنے کے میدان میں آ کر ٹکڑوں ٹکڑوں کی دھار بدل دی گئی ہے اور وہ بیرون و بیرون مشغول ہو جاتے ہیں۔ یہی حال ان جماعتوں کے افراد کا بھی ہوا۔ خیالی راہ اختیار کرتے وقت جماعتوں کا جو سیلاب آیا وہ افراد کے ذہنوں کی دھار کند کر دیتا۔

سوشلزم کو سائنس و علم بنانے کے لئے ضروری تھا کہ اس کی عمارت کی حقیقی بنیاد پر قائم کی جاتی۔

دوسرا باب

اسی درمیان میں، اٹھارویں صدی کے فرانسیسی فلسفے کے بعد، جدید ترین جرمن فلسفہ کی ابتدا ہوئی۔ اس فلسفہ کا آخری مرد میدان ہیگل تھا۔ جدید فلسفے کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اُس نے جدلیات کو استدلال کی سب سے بہتر صورت قرار دیا۔ یونان کے سارے قدیم فلسفی شروع ہی سے فطرتاً جدلیاتی تھے، ارسطو نے، جو اپنی ہمہ گیر قابلیت کی بنا پر ان فلسفیوں کا سرتاج گنا جاتا ہے، تصور کی اُن اہم ترین شکلوں کا جو جدلیات کے اُصول کے ماتحت ہیں، اُنھیں دِنوں تجزیہ بھی کر لیا تھا۔ گو فلسفہ جدید میں جدلیات کے بعض بڑے لائق ترجمان گذرے ہیں مثلاً دیکارت اور اسپائی نوزا[۵۹] لیکن فلسفہ جدید کا رجحان زیادہ تر اس کے برعکس ہی رہا ہے۔ فلسفہ جدید نے برطانوی اثر کے تحت مابعد الطبیعاتی طریقہ استدلال کو ترجیح دی اور دیر سے دیر سے اسی پر قائم ہوتا گیا۔ اور اپنی لچک کھوتا گیا۔ استدلال کا یہی مابعد الطبیعاتی طریقہ اٹھارویں صدی میں فرانسیسیوں پر اور بالخصوص اُن کے فلسفے پر عام طور سے حاوی تھا۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ فلسفے سے قطع نظر، بعض فرانسیسیوں نے جدلیات کے شاہ کار پیش کئے ہیں یہاں صرف دیدرو کی کتاب رامیو کا بھتیجا اور روسو کی کتاب "بنی نوع انسان میں عدم مساوات کی ابتدا اور اُس کے بنیادی اسباب پر مباحثہ"

---

۵۹ ۔ اسپائی نوزا (۱۶۳۲ء تا ۱۶۷۷ء) ڈچ فلسفی جو ایک حد تک دیکارت کا ہم خیال تھا۔ اس کی مشہور تصنیف "اخلاق" ہے۔ وہ وحدت الوجود اور ہمہ اوست کا معتقد ہے لیکن کائنات کے خارجی وجود کو تسلیم کرتا ہے۔

کا دامن کافی ہوگا۔ یہاں ہم استدلال کے جدلیاتی اور مابعد الطبیعیاتی دونوں طریقوں کی بنیادی خصوصیتیں مختصر طور پر بیان کریں گے۔

جب ہم کائنات، انسانی تاریخ یا خود اپنے ذہن کی فعلیت پر غور کرتے ہیں تو ہمیں ایک تعلقات اور ان تعلقات کے ردعمل اور ان تعلقات و اثرات کے بھی ردعمل کی لامتناہی الجھنوں کی ایک ایسی تصویر نظر آتی ہے جس میں کسی شے کی اپنی حیثیت اور جگہ پر ایک لمحے کے لئے بھی ساکت اور ثابت نہیں رہتی۔ بلکہ ہر چیز حرکت کرتی رہتی ہے، تبدیل ہوتی، وجود میں آتی اور فنا ہوتی رہتی ہے۔ ابتدا میں ہم اس تصویر کو مجموعی طور پر دیکھتے ہیں جبکہ تصویر کے اجزا سے زیادہ الگ الگ غور نہیں کیا جاتا بلکہ ہم تصویر کے اجزا کی مجموعی حرکت، تعلقات اور تبدیلیوں پر غور کرتے ہیں نہ کہ خود اُن چیزوں پر جو حرکت کرتی، آپس میں ملتی اور ایک دوسرے سے رشتہ قائم کرتی ہیں۔ کائنات کا یہ ابتدائی لیکن بنیادی اعتبار سے صحیح تصور، قدیم یونانیوں کا دیا ہوا ہے۔ سب سے پہلے ہیراقلیطس نے واضح طور سے مرتب کیا تھا۔ ہر شے "ہے" اور "نہیں ہے" کیوں کہ ہر شے متحرک ہے، برابر بدلتی، وجود میں آتی اور فنا ہوتی رہتی ہے۔

اس تصور سے مظاہر قدرت کی نوعیت مجموعی طور سے تو ٹھیک ٹھیک ظاہر ہو جاتی ہے لیکن اُن کے اجزاء اور تفصیلات کی تشریح نہیں ہوتی۔ اس تشریح کے بغیر پوری تصویر کا صحیح تصور ممکن نہیں۔ ان تفصیلات کے جاننے کے لئے ضروری ہے کہ تصویر کے اجزاء ترکیبی کو ان کے قدرتی یا تاریخی پس منظر یا ماحول سے علیحدہ کر لیا جائے اور ان کی الگ الگ جانچ کی جائے، ان کی خصوصیت، ان کی نوعیت اور ان کے اسباب و علل کا پتہ لگایا جائے۔ علوم طبعی اور تاریخی تحقیق کا سب سے اہم فرض یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یونانی عہد میں سائنس کے شعبوں کو ثانوی حیثیت دی گئی۔ یونانیوں کے سامنے سب سے پہلا کام ان شعبوں کے لئے مواد اکٹھا کرنا تھا۔ کے عہد میں شروع ہوا [illegible] اشیاء کو طبقوں جنسوں اور صنفوں میں تقسیم کرنے اور ترتیب دینے سے قوت طبعی اور تاریخی مواد کو مجموعی طور

جمع کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ علوم طبیعی کی بنیادیں سب سے پہلے عہد اسکندریہ[60] میں یونانیوں نے قائم کیں اور اُن کے بعد قرونِ وسطیٰ میں عربوں نے اسے مزید ترقی دی۔ لیکن علوم طبیعی کی ابتدا سچ مچ اٹھارویں صدی کے نصف میں ہوئی۔ اُس وقت سے علوم طبیعی برابر تیزی سے بڑھتے رہے ہیں۔ مظاہر قدرت کے اجزا ترکیبی کی تقسیم، مختلف قدرتی افعال اور مدرکات کی خاص طبقوں میں صف بندی، اور نامیاتی اجسام کی اندرونی ہیئت کا اُس کی مختلف شکلوں میں مطالعہ، یہ تھے وہ بنیادی کارنامے جن کے بدولت علوم طبیعی نے پچھلے چار سو سال میں زبردست ترقی کی ہے۔ لیکن اس طرح مطالعہ اور مشاہدہ کرنے سے ہم میں ایک دوسری عادت پیدا ہو گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہم قدرتی اشیاء اور اُن کے حرکات و افعال کو اُن کے تاریخی اور قدرتی پس منظر سے الگ کر کے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہم ان چیزوں کا مشاہدہ اُس وقت نہیں کرتے جب وہ متحرک ہوتی ہیں بلکہ اُس وقت کرتے ہیں جب وہ نسبتاً بے حرکت ہوتی ہیں۔ ہم اس خیال کے عادی ہو گئے ہیں کہ یہ چیزیں بالکل ساکت و ثابت ہیں یعنی اُن کی خصلت، فطرت، ماہیت اور ہیئت میں نہ کوئی تبدیلی ہوتی اور نہ کوئی کمی بیشی۔ مختصر یہ کہ ہم لوگ خارجی اشیا کا مشاہدہ اُن کی "زندگی" میں نہیں کرتے بلکہ اُس وقت کرتے ہیں جب اُن پر موت کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ بیکن اور لاک نے مشاہدہ کا یہ طریقہ علوم طبیعی سے فلسفہ کی طرف منتقل کیا تو اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں کا زاویۂ نظر اور تنگ ہو گیا اور غور و فکر کا وہ مابعد الطبیعیاتی طریقہ رائج ہوا جو اٹھارویں صدی کی خصوصیت ہے۔

مابعد الطبیعیات کے حامیوں کے نزدیک مدرکات اور اُن کے ذہنی پرتو یعنی تصورات دو الگ الگ چیزیں ہیں جن پر یکے بعد دیگرے اور الگ الگ غور کرنا چاہیے۔ یہ مدرکات ایسے ہیں جو

---

[60] عہد اسکندریہ سے مراد تیسری صدی قبل مسیح سے لے کر تیسری صدی عیسوی تک کا زمانہ ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ مصر کا مشہور شہر اور بندرگاہ اسکندریہ ہے جو اس زمانے میں تمدن اقوام کے معاشی تعلقات کا ایک بڑا اہم مرکز تھا۔ عہد اسکندری میں علوم قطعی اور علوم طبیعی جیسے ریاضی (اقلیدس اور ارشمیدس)، جغرافیہ، علم ہیئت، اعضاء انسانی کی تشریح اور ان کے اعمال و افعال کے علوم نے بڑی ترقی کی۔

قدیم ہیں، ایک جگہ قائم ہیں جن میں کوئی لچک نہیں یا کوئی تبدیلی نہیں، وہ ازل سے ابد تک ایک ہی حال میں رہیں گے۔ ایسی فکر رکھنے والا شخص ہمیشہ ان کی جانچ کرتا رہتا ہے۔ اُن کا اصول ہے کہ متضاد چیزوں میں ایک کوئی کبھی ربط یا لگاؤ ممکن نہیں۔ ایک کا "ہونا" دوسرے کے "نہ ہونے" کی دلیل ہے۔ اجتماعِ ضدین یا نقیضین محال ہے۔ جیسے لفظوں میں یوں کہئے کہ "ہاں" "ہاں" ہے اور "نہیں" "نہیں"۔ اور "ہاں" اور "نہیں" کو کسی ایک ہی نقطہ پر جمع کرنا شیطانی فعل ہوگا۔ اُن کے لحاظ سے ایک ایک شے یا تو ہے یا نہیں ہے۔ یا تو اس کا وجود ہے یا وہ موجود نہیں ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک چیز ایک ہی وقت میں وہ چیز بھی ہو جس سے وہ معلوم ہوتی ہے اور کوئی اور دوسری چیز بھی ہو۔ اثبات اور نفی ایک دوسرے کی ضد ہیں اور یوں سبب اور نتیجہ، علت و معلول ایک دوسرے کی ضد ہیں جن کے مقام الگ الگ ہیں۔

پہلی نظر میں تو سوچنے کی، افکار اور استدلال کا یہ طریقہ بڑا معقول اور منطقی نظر آتا ہے کیوں کہ یہ بڑی عقلی سی بات ہے جو بظاہر ٹھیک معلوم ہوتی ہے اور عقلِ سلیم اسے آسانی سے قبول کر لیتی ہے۔ لیکن اپنی گھریلو چہار دیواری سے باہر نکل کر تحقیقات اور مطالعہ کی دنیا میں قدم رکھتے ہی اس عقلِ سلیم کو بڑے حیرت انگیز انکشافات اور تجربوں سے سابقہ پڑنے لگتا ہے۔ غور و فکر کا مابعد الطبیعاتی طریقہ بعض حالتوں میں اپنے محدود دائرہ تحقیق کی نوعیت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں مناسب اور ضروری ہوتا ہے لیکن جلد یا بدیر وہ منزل آ ہی جاتی ہے جس سے گزرنے کے بعد یہ طریقہ فکر ایک اکہرا، محدود اور مبہم ہو جاتا ہے اور اس میں ایسی متضاد گتھیاں پڑ جاتی ہیں جن کا سلجھانا اس کی قوت سے باہر ہوتا ہے۔ چیزوں کو انفرادی طور پر الگ الگ کر کے دیکھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مابعد الطبیعیات ان کے باہمی تعلق اور رشتوں کو بھول جاتی ہے۔ ان کے وجود پر غور کرتے وقت ان کی ابتدا اور انتہا کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ "سکون" کی حالت میں ان کی جانچ کرتے وقت ان کی "حرکت" کا خیال نہیں کرتی۔ درختوں کو دیکھنے میں جنگل اس کی نظر سے غائب ہو جاتا ہے۔

روزانہ کے معمولی واقعات کی حد تک تو ہم اثبات اور نفی کو الگ کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلاں جانور زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ خود موت اور زندگی کے درمیان حد قائم کرنا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ قانون سے واسطہ رکھنے والے اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ کافی محنت اور تحقیق کے بعد بھی یہ لوگ کوئی معقول حد متعین نہیں کر سکے ہیں جس سے گزرنے کے بعد ماں کے بطن میں بچہ کی ہلاکت کو قتل سے تعبیر کیا جا سکے لمحۂ موت کا تعین بھی اُتنا ہی ناممکن ہے کیوں کہ علم الاجسام کا کہنا ہے کہ موت کوئی فوری اور ناگہانی چیز نہیں ہے بلکہ ایک بہت ہی طویل عمل ہے۔

اسی طرح ہر نامیاتی چیز ہر لمحہ وہ چیز بھی ہے جس کا اُس پر اطلاق ہوتا ہے اور پھر بھی بالکل وہ چیز نہیں ہے۔ ہر لمحہ وہ خارجی مادے کے اجزا قبول کرتی اور داخلی مادے کے اجزا جسم سے خارج کرتی رہتی ہے۔ ہر لمحہ اُس کے جسم کے بعض خلیے ختم ہوتے اور اُن کی جگہ دوسرے نئے خلیے بنتے رہتے ہیں۔ کچھ مدت بعد جسم کا پُرانا مادہ بالکل ختم ہو جاتا ہے اور مادے کے دوسرے نئے سالمے اُس کی جگہ لے لیتے ہیں۔ چنانچہ ہر نامیاتی چیز ہر لمحہ وہ چیز بھی ہوتی ہے جس کا اُس پر اطلاق ہوتا ہے اور ساتھ ہی کوئی دوسری چیز بھی ہوتی ہے۔

اور زیادہ گہری نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ایک متضاد کے دونوں سرے یعنی اثبات اور نفی جتنا ایک دوسرے کی ضد ہیں اُتنا ہی ایک دوسرے سے منسلک بھی ہیں — اتنے منسلک کہ انھیں الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ضد اور اختلاف کے باوجود دونوں ایک دوسرے میں پیوست ہوئے ہیں۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سبب اور نتیجہ، علت اور معلول ایسے تصورات ہیں جو اکا دکا واقعات پر تو صادق آتے ہیں لیکن جونہی ہم ان انفرادی واقعات کو پوری کائنات سے ملا کر مجموعی نظر سے ان پر غور کرتے ہیں تو علت و معلول کے یہ دونوں مختلف سرے ایک دوسرے میں پیوست ہوتے نظر آتے ہیں۔ پھر جب ہم اُس آفاقی عمل اور ردعمل پر غور کرتے ہیں جس میں علت و معلول برابر ایک دوسرے کی جگہ لیتے رہتے ہیں اس طرح کہ ایک وقت میں جو چیز علت ہوتی ہے وہی آگے چل کر خود

معلول ہو جاتی ہے اور جو معلول ہوتی ہے وہ آگے چل کر علت بن جاتی ہے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ علت اور معلول کے دونوں مختلف سرے الگ نہیں بلکہ ایک دوسرے میں بالکل ضم ہیں۔

غور و فکر کا وہ طریقہ جو اوپر بیان کیا گیا ہے مابعد الطبیعاتی طریقہ استدلال کے ڈھانچے میں نہیں سما سکتا۔ لیکن جدلیات، مابعد الطبیعاتی استدلال کے برعکس، اشیاء اور اُن کے پرتو (تصورات) پر اُن کے باہمی لگاؤ، اور تسلسل اور اُن کی حرکت اور ابتدا اور انتہا کا لحاظ رکھتے ہوئے غور کرتی ہے۔ اوپر بیان کی ہوئی تفصیلیں جدلی طریقہ کار کی متعدد شہادتیں ہیں۔

خود قدرت جدلیات کی سچائی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ جدید سائنس نے اس کی حمایت میں بڑے عمدہ مواد جمع کئے ہیں جو روز بروز بڑھتے جاتے ہیں اور یہ بھی دکھا دیا ہے کہ قدرت کی حرکت کی نوعیت جدلی ہے نہ کہ مابعد الطبیعاتی۔ کائنات کسی ایسے واحد ابدی حلقے میں نہیں گھومتی جس میں کوئی پھیلاؤ یا تبدیلی نہ پیدا ہوتی ہو بلکہ سچ مچ تاریخی ارتقا کے مدارج طے کرتی ہے۔ اس قسم کا مواد فراہم کرنے والے سائنس دانوں میں ڈارون سب سے آگے ہے۔ اُس نے یہ ثابت کر کے کہ تمام نامیاتی موجودات ـــــ پودے، حیوانات اور خود انسان ـــــ اُس ارتقائی عمل کی پیداوار ہیں جو لاکھوں سال سے جاری ہے۔ قدرت کے مابعد الطبیعیاتی تصور پر سب سے کاری ضرب لگائی۔ لیکن اُن ماہرین طبیعیات کی تعداد جنھوں نے جدلی طریقے پر سوچا ہے، بہت کم ہے اور وہ بڑے دقتوں سے گزرے ہیں۔ ان دنوں علوم طبیعی کی بحثوں میں جو لامتناہی ابتری اور بوکھلاہٹ پائی جاتی ہے اور معلمین اور متعلمین اور کتابیں لکھنے والوں اور اُن کے پڑھنے والوں میں جو عام مایوسی اور بے دلی نظر آتی ہے وہ صرف اُسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب ہم اُس تضاد اور تصادم کی اصل حقیقت جان لیں، جو سائنٹفک تحقیقات کے نتائج اور اُن خیالات میں پایا جاتا ہے جن پر لوگ بلا کسی تجرباتی ثبوت کے پہلے سے قائم تھے۔

کائنات کی ٹھیک تشریح، اُس کا ارتقا، انسان کی ترقی اور اُس کے ذہن میں اس ترقی

کا عکس۔ غرض یہ ساری باتیں صرف جدلی طریقۂ کار کے ذریعے سمجھ میں آسکتی ہیں کیوں کہ یہی وہ طریقہ ہے جو زندگی اور موت کے لاتعداد عمل اور ردِّ عمل، اور ترقی پسند اور رجعت پسند تغیرات کا لحاظ رکھتا ہے۔ جدید جرمن فلسفے نے شروع سے اسی نقطۂ نظر کی پیروی کی۔ کانٹ نے اپنے فلسفیانہ جستجو کی ابتدا نیوٹن[۶۲] کے نظامِ شمسی سے کی۔ نیوٹن اس نظامِ شمسی کو قدیم اور ایک جگہ پر قائم مانتا تھا اور کہتا تھا کہ کسی شعوری قوت نے اسے ایک بار بنا دیا ہے اور یہ ازل سے یونہی قائم ہے اور ابد تک یونہی رہے گا۔ کانٹ نے ثابت کیا کہ نیوٹن کا یہ دعویٰ غلط ہے۔ یہ نظامِ شمسی ایک تاریخی عمل کا نتیجہ ہے جس نے ارتقا کے کئی مدارج طے کئے ہیں۔ سورج اور دوسرے اجرامِ فلکی گردش کرنے والے کسی بادل جیسے دھندلے ڈھیر سے بنے ہیں۔ اس سے اُس نے یہ نتیجہ بھی نکالا کہ نظامِ شمسی کے آغاز کا اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو مستقبل میں اس کی تباہی بھی ایک لازمی امر ہے۔ آدھی صدی بعد کانٹ کے اس نظریہ کی تصدیق لاپلاس نے اعداد و شمار سے کی۔ اس کے پچاس برس بعد طیف پیما آلہ نے ثابت کر دیا کہ خلا میں واقعی ایسی دہکتی ہوئی گیس اب بھی موجود ہے جو انجماد کے مختلف دوروں سے گزر رہی ہے۔

یہ جدید جرمن فلسفہ ہیگل کے نظریے میں اپنی معراج کو پہنچ گیا۔ اس نظریے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے نزدیک پوری دنیا ــــ طبیعی، تاریخی اور ذہنی ــــ پہلی بار ایک استمراری عمل قرار پائی۔ اس نظریے میں یہ دعویٰ پیش کیا گیا کہ دنیا ــــ طبیعی تاریخی اور ذہنی ــــ برابر متحرک اور متغیر ہے اور نت نئے قالب بدلتی اور ترقی کرتی رہتی ہے۔ ساتھ ہی یہ کوشش بھی کی گئی کہ اُس اندرونی تعلق، اُس داخلی رشتے، کا پتہ لگایا جائے جو اس ساری حرکت اور ترقی کو آپس میں جوڑے ہوئے ہے اور اُسے ایک وحدت بنائے ہوئے ہے۔ اس نقطۂ نظر کے

---

[۶۲] سر اسحاق نیوٹن۔ (۱۶۴۲ء تا ۱۷۲۷ء) برطانیہ کا مشہور سائنس داں، نجومی اور فلسفی۔ اس نے زمین کی کشش کا قانون دریافت کیا، حرکت کے قوانین مرتب کئے اور نور (سفید روشنی) کے اجزائے ترکیبی معلوم کئے۔

سابق انسان کی تاریخ، تشدّد کی داستان اور مجنونانہ حملوں کا ایک لامتناہی سلسلہ نہیں جس پر فلسفیانہ انصاف پسندی اور پختہ مغز استدلال اور معقولیت کی بلندیوں سے لعنت ملامت کی جائے اور جس کو جلد سے جلد بھول جانا ہی مناسب خیال کیا جاتا ہو، بلکہ اس نقطۂ نظر نے انسانی تاریخ کو خود انسان کا ارتقائی عمل قرار دیا۔ اس دعویٰ کو مان لینے کے بعد انسان کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس "استراری عمل" کی رفتار معلوم کرے اور اُس کے قدموں کے نشان ڈھونڈھے کیونکہ انسانی تاریخ کے قدم بڑی پیچ در پیچ راہوں سے ہو کر گزرے ہیں، اور پھر اُس اندرونی قانون اُس داخلی اصول کا پتہ لگائے جو ان تاریخی واقعات کی رگوں میں پیوست ہیں اور جنھیں ہم اب تک حادثات سے تعبیر کرتے رہے ہیں۔

یہاں اس حقیقت سے بحث نہیں کہ ہیگل کا نظریہ اپنے قائم کئے ہوئے مقدمے کو حل نہ کر سکا۔ اُس کا عہد آفریں کارنامہ تو یہ ہے کہ اُس نے اس مسئلہ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ جہاں تک حل کرنے کا سوال ہے یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ اسے کوئی ایک شخص کبھی حل کر سکتا ہو۔ گو ہیگل بھی سینٹ سائمن کی طرح (قابلیت اور ذہنی استطاعت کے اعتبار سے) اپنے عہد کا سب سے ہمہ داں اور ہمہ گیر انسان تھا لیکن اس کے باوجود اُسے دو دشواریاں تھیں۔ پہلی دشواری تو یہ تھی کہ اُس کا علم بہر حال محدود تھا (اور کون ہے جو سب کچھ جاننے کا دعویٰ کر سکے) دوسری دشواری یہ تھی کہ خود اُس کے عہد میں علم اور تصوّرات کی وسعت اور گہرائی بھی محدود تھی۔ (ہیگل صرف وہی باتیں جان سکتا تھا جو اُس عہد میں جانی جا سکتی تھیں۔ آنے والے زمانہ کے علوم اور انکشافات کو وہ کیوں کر جان سکتا تھا) ان دونوں دشواریوں میں ایک تیسری دشواری کا بھی اضافہ کیجئے اور وہ یہ تھی کہ ہیگل خود ایک تصوریت پرست تھا۔ اُس کے نزدیک ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات، مدرکات اور اُن کے عمل کی کم و بیش کوئی مجرّد تصویر نہ تھے بلکہ اُس کے برعکس مدرکات اور اُن کا ارتقا "تصور" کی تصویر تھا۔ اور یہ تصوّر کائنات کے وجود سے پہلے یعنی ازل سے کسی جگہ موجود تھا۔ اس طریقۂ فکر نے مدرکات کو اُن کے سر کے بل کھڑا کر دیا اور کائنات میں اشیا کا جو باہمی تعلق

پایا جاتا ہے اُس کو بالکل اُلٹ دیا۔ مانا کہ ہیگل نے اپنی ذہانت سے مختلف واقعات اور اُن کے باہمی تعلقات کی صحیح نبض شناسی کی لیکن اوپر بیان کی ہوئی دشواریوں کا اثر یہ ہوا کہ ہیگل کی پیش کی ہوئی اکثر تفصیلات بنا دٹی اور غلط ثابت ہوئیں۔ ہیگل کا نظریہ دراصل ایک بردست استقاط تھا لیکن اپنی قسم کا آخری استقاط ـــــ اس نظریہ میں ایک ایسا اندرونی تضاد پایا جاتا تھا جس کا کوئی حل ممکن نہ تھا۔ ایک طرف تو اُس کا بنیادی دعویٰ یہ تھا کہ انسانی تاریخ ایک "استمراری عمل" ہے جس کا خمیر ہی اس قسم کا ہے کہ وہ اُس "حقیقت مطلق" کا پتہ نہیں لگا سکتی جو ذہنی فعلیت کی آخری حد ہے۔ لیکن دوسری طرف اس کا یہ دعویٰ بھی تھا کہ یہ نظریہ اسی "حقیقت مطلق" کی روح ہے۔ طبیعی اور تاریخی علوم کا وہ نظریہ جو یہ دعویٰ کرے کہ وہ ہر عہد کے لئے مکمل اور حرفِ آخر ہے، جدلی طریقۂ استدلال کے بنیادی قانون کے منافی ہے۔ اس جدلی قانون کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ کائنات کے بارے میں ہمارا علم عہد بہ عہد ترقی کرتا اور کر سکتا ہے۔

جرمن تصوریت کے اس بنیادی تضاد کو محسوس کر لینے کے بعد مادیت کی طرف لوٹنا ضروری ہو گیا۔ لیکن یاد رہے کہ یہ قدم اٹھارویں صدی کی خالص مابعد الطبیعیاتی اور میکانکی مادیت کی سمت نہیں اُٹھا۔ پرانی مادیت تمام پچھلی تاریخ کو تشدد اور بے عقلی کا انبار خیال کرتی تھی اس کے برخلاف جدید مادیت کو تاریخ میں انسانی ارتقا کے نشان نظر آتے ہیں اور وہ اس فکر میں ہے کہ انسانی ارتقا کے بنیادی قانون معلوم کرے۔ اٹھارویں صدی کے فرانسیسیوں اور خود ہیگل کے بدولت قدرت کے بارے میں یہ تصور رائج ہوا کہ قدرت بحیثیت مجموعی تنگ دائروں میں حرکت کرتی ہے اور غیر متغیر ہے۔ نیوٹن نے یہ تعلیم دی کہ قدیم اجرام فلکی بھی انھیں دائروں میں گردش کرتے ہیں۔ لیوئیس نے یہ تعلیم دی کہ قدرت ایسی نامیاتی جنسوں میں بٹی ہوئی ہے جن کو بدلا نہیں جا سکتا۔ لیکن جدید مادیت نیچرل سائنس کے تازہ ترین انکشافات اور تجربوں سے مدد لیتی ہے۔ ان تجربوں اور انکشافوں کے مطابق قدرت بھی اپنی ایک تاریخ رکھتی ہے جو وقت کے ساتھ ترقی کرتی رہتی ہے۔ اجرام فلکی بھی نامیاتی اجسام کی مانند (جو سازگار حالات میں ان اجرام فلکی میں پائے جاتے ہیں) پیدا ہوتے

اور فنا ہوتے رہتے ہیں۔ اور اگر اردار کی تکرار مان لی جائے تو بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان دائروں کا پھیلاؤ برابر بڑھتا جاتا ہے۔ یعنی دونوں صورتوں میں جدید مادیت بنیادی طور پر جدلی طریقہ کار کی پابند ہے اور اب کسی ایسے فلسفے کی ضرورت نہیں رہی جو تمام علوم پر حاوی ہو۔ جیسے ہی فرداً فرداً ہر سائنس نے مدرکات اور مدرکات کے بارے میں ہمارے علم کی مجموعی نظام میں اپنی حیثیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ویسے ہی وہ مخصوص سائنس جس کا تعلق سارے مجموعی نظام سے تھا بے کار ہو گئی۔ اور اب تمام قدیم فلسفے کی بالکل ہی نشانی رہ گئی ہے اور وہ ہے علم استدلال اور اس کے قوانین یعنی منطق کا طریق استدلال اور جدلیات بقیہ تمام علوم، تاریخ اور کائنات کے ثبوتی[62] علوم میں ضم ہو گئے ہیں۔

ہمارا کائنات کا تصور بھی اسی نسبت سے بدلا جس نسبت سے کہ کائنات کے بارے میں ثبوتی مواد جمع ہوا۔ لیکن اس سے بہت پہلے بعض ایسے تاریخی واقعات پیش آئے جنھوں نے تاریخ کے تصور میں ایک فیصلہ کن تبدیلی کا موقع دیا۔ ۱۸۳۱ء میں لیونس[63] میں مزدور جماعت کی پہلی شورش ہوئی۔ ۱۸۳۸ء اور ۱۸۴۲ء کے درمیان مزدور طبقے کی پہلی قومی تحریک یعنی انگریز چارٹسٹوں کی تحریک اپنے عروج کی آخری منزلوں پر پہونچی۔ یورپ کے سب سے ترقی یافتہ ملکوں میں مزدوروں اور سرمایہ داروں کی طبقاتی جدوجہد تاریخ کے صفحوں پر نمایاں ہونے لگی اور جس رفتار سے جدید صنعت نے ترقی کی اور سرمایہ داروں کا سیاسی اقتدار بڑھا اسی رفتار سے یہ جدوجہد بھی بڑھی۔ واقعات نے سرمایہ داروں کی اس تعلیم کو کہ سرمایہ اور محنت کے مفاد ایک ہی ہیں اور بے روک ٹوک مسابقت سے عام خوش حالی اور ہم آہنگی پھیلتی ہے، روز بروز زیادہ شدت سے جھٹلایا۔ ان حقیقتوں

---

[62] ثبوتی سے مراد وہ مواد ہے جس کی بنیاد ثبوت اور مشاہدے پر ہو۔

[63] شہر لیونس میں ۱۸۳۱ء میں ایک کپڑے کے کارخانے کے مزدوروں نے اجرت میں اضافے کے مطالبے پر ہڑتال کا اعلان کر دیا تھا۔ ایک مظاہرے کے دوران میں پولس نے گولی چلائی جس میں کئی مزدور مارے گئے۔ اس کے جواب میں مزدوروں نے شہر میں جگہ جگہ دھس بندیاں قائم کیں اور کئی دنوں تک شہر پر قبضہ کئے رہے جب حکومت نے باقاعدہ فوج بھیجی تب کہیں شدید مقابلے کے بعد انھیں شہر سے بے دخل کیا جا سکا۔

کی طرف سے آنکھیں نہیں چُرائی جاسکتی تھیں اور نہ فرانسیسی اور برطانوی سوشلزم کو بُھلایا جاسکتا تھا جو اِن حقیقتوں کے ناقص لیکن نظری مظہر تھی۔ لیکن تاریخ کا پُرانا تصوری نظریہ جو اب تک لوگوں کے ذہنوں پر حاوی تھا اُس طبقاتی جدوجہد سے واقف نہ تھا جس کی بنیادیں معاشی مفاد پر قائم ہیں۔ وہ اتنا بھی نہ جانتا تھا کہ یہ معاشی مفاد ہے کیا بلا۔ تاریخ کے صفحوں پر پیداوار اور انسانوں کے معاشی تعلقات کا ذکر چلتے چلاتے ہو جایا کرتا تھا اور ان باتوں کو معمولی واقعات ــــ "تاریخ تہذیب کے ضمنی عناصر و عوامل ــــ" سمجھ کر ٹال دیا جاتا تھا۔ اس سے زیادہ ان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

لیکن زندگی کی نئی حقیقتوں نے مجبور کیا کہ تمام پچھلی تاریخ پر نظر ثانی کی جائے۔ چھان بین کی گئی تو پتہ چلا کہ تمام پچھلی تاریخ ــــ باستثنائے ابتدائی عہد کے ــــ طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے۔ اور یہ آپس میں ٹکرانے والے طبقے خود پیداوار کے طریقوں اور جنسوں کے تبادلے کی پیداوار ہیں۔ یعنی اپنے وقت کے معاشی حالات کی پیداوار ہیں۔ اور سماج کا معاشی ڈھانچہ ہی وہ حقیقی بنیاد ہے جس پر غور کرنے کے بعد کسی عہد کے قانونی اور سیاسی اداروں، اور مذہبی فلسفیانہ اور دوسرے خیالات کی صحیح صحیح تشریح کی جاسکتی ہے۔ اور انھیں سمجھا جاسکتا ہے۔ ہیگل نے تاریخ کو مابعد الطبیعیات سے نجات دلائی۔ اُس نے تاریخ کو جدلی بنایا۔ لیکن اُس کا تاریخ کا تصور خالص تصوری تھا۔ لیکن اب تصوریت کو اُس کی آخری جائے پناہ ــــ فلسفہ تاریخ ــــ سے بھی نکال باہر کیا گیا۔ اب تاریخ کا ایک مادی تصور پیش کیا گیا، اس طرح ایک ایسا طریقہ کار ہاتھ لگا جس کی مدد سے انسان کے "شعور" کی تشریح اُس کے "وجود" سے کی گئی۔ درآنحالیکہ اب تک انسان کے "وجود" کی تشریح اُس کے "شعور" سے کی جاتی تھی۔

اُس وقت سے سوشلزم کسی ذہین آدمی کے دماغ کا اچانک انکشاف نہیں بلکہ اُن دو طبقوں ــــ سرمایہ دار اور مزدور ــــ کی باہمی نزاع کا لازمی نتیجہ قرار پائی جن کو تاریخ نے ترقی دے کر سب سے آگے کر دیا ہے۔ سوشلزم کا کام اب یہ نہیں رہا کہ کوئی مکمل ترین سماجی ڈھانچہ تیار کرے بلکہ اس کا کام یہ رہا کہ واقعات کے اُس تاریخی اور معاشی تسلسل کی جانچ کرے جس کے اثر

سے یہ طبقے اور ان کی باہمی نزاع لازمی طور سے ابھری ہیں اور پھر ان نئے معاشی حالات کی تہ میں چھپی ہوئی ان طاقتوں کا پتہ لگائے جو اس نزاع کو ختم کر سکتی ہیں۔ لیکن ابتدائی سوشلزم کو تاریخ کے اس مادی تصور سے اتنا ہی بیر تھا جتنا فرانسیسی مادئین کے تصور کائنات کو جدلیات اور جدید نیچرل سائنس سے ہے۔ ابتدائی سوشلزم موجودہ سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار اور اس کے نتائج پر اعتراض تو ضرور کرتا تھا لیکن وہ اس نظام کی تشریح نہ کر سکتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ اس کو اچھی طرح سمجھ بھی نہ پاتا تھا اور اس طریقہ پیداوار اور اس کے نتیجوں کو صرف برا بھلا کہہ کر دل کی بھڑاس نکال لیتا تھا۔ سوشلزم مزدوروں کے لوٹے جانے پر، جو سرمایہ دارانہ نظام میں ناگزیر ہے، جتنی شدت سے ملامت کرتا اسی قدر وہ یہ بتانے میں ناکام رہتا کہ یہ لوٹ پیدا کیوں کر ہوتی اور آپ اس کی نوعیت کیا ہے۔ اس کے لئے تو یہ ضروری تھا کہ ایک طرف سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار کو اس کے تاریخی تسلسل اور پس منظر میں پیش کیا جائے اور بتایا جائے کہ ایک مخصوص تاریخی عہد میں یہ نظام اٹل ہے۔ پھر یہ بھی بتایا جائے کہ جس طرح اس کا آنا اٹل ہے اسی طرح اس کا زوال بھی اٹل ہے۔ اور دوسری طرف اس کی اصل خصوصیت جو اب تک ایک راز تھی واضح کی جائے۔ فاضل قدر کے پتہ لگانے سے یہی ہوا۔ اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار اور اس کے تحت مزدوروں کی لوٹ کی بنیاد دراصل اس محنت کی لوٹ ہے جس کی اجرت مزدوروں کو نہیں دی جاتی۔ اور سرمایہ دار اگر مزدور کی قوت محنت کو بحیثیت ایک جنس کے بازار میں پوری قدر پر خریدے تو بھی اس نے جتنی قیمت ادا کی ہے اس سے زیادہ قدر (اس محنت سے) حاصل کر لیتا ہے۔ اگر اس سلسلے کی آخری کڑی تک پیچھا کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہی فاضل قدر، قدر کا وہ ذخیرہ بن جاتی ہے جس کے بدولت سرمایہ روز بروز ملکیت والے طبقوں ہی کے ہاتھ میں اکٹھا ہوتا جاتا ہے۔ اس طرح سرمایہ دارانہ پیداوار کے طریق عمل اور سرمایے کی تخلیق دونوں باتوں کی تشریح ہو گئی۔

ان دونوں عظیم الشان انکشافات ——— تاریخ کا مادی تصور اور فاضل قدر کا

نظریہ جو سرمایہ دارانہ پیداوار کی اصل خصوصیت ہے ـــــ کے لئے ہم مارکس کے مرہونِ منّت ہیں۔ ان دونوں انکشافوں کے بعد سوشلزم ایک علم (سائنس) بن گیا جس کے تمام پہلوؤں کو پوری تفصیل سے ترقی دینا پہلا کام تھا۔

تیسرا باب

تاریخ کا مادی نظریہ اس دعوے سے شروع ہوتا ہے کہ ہر سماجی نظام کی بنیاد ضروریات زندگی کی پیداوار اور اس کے تبادلے پر ہے۔ اور ہر اس سماج میں جس کے نشان تاریخ کے صفحات پر پائے جاتے ہیں پیداوار کو تقسیم کرنے اور سماج کو جماعتوں اور طبقوں میں بانٹنے کا طریقہ اس پر منحصر ہے کہ سماج کیا پیدا کرتی ہے، کیونکر پیدا کرتی ہے اور پھر آپس میں پیداوار کا تبادلہ کیسے ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اب تک سماج میں جو تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور دنیا میں جو سیاسی انقلاب آئے ہیں ان کے بنیادی اسباب آدمیوں کے ذہنوں میں نہیں پائے جاتے۔ ان کا سبب "ابدی حق اور انصاف" کے بارے میں انسان کی بڑھتی ہوئی بصیرت میں نہیں بلکہ ان تبدیلیوں میں ملے گا جو پیداوار اور تبادلے کے طریقوں میں رونما ہوئی ہیں۔ ان کا سراغ لگانے کے لئے اس عہد کے فلسفے کی نہیں بلکہ معاشیات کی چھان بین کرنی چاہئے۔ یہ احساس اب عام ہوتا جا رہا ہے کہ موجودہ سماجی ادارے عقل اور انصاف پر مبنی نہیں ہیں۔ کل روز پہلے کی معقولیت اب لغویت کی سرحد پر پہنچ گئی ہے اور خیر شر سے بدل گیا ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ پیداوار اور تبادلے کے طریقے چپکے چپکے بدلتے رہتے ہیں اور ان کے ساتھ وہ سماجی نظام جو پہلے کے معاشی حالات سے مطابقت رکھتا تھا، اب میل نہیں کھاتا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ جو خرابیاں ظاہر ہوئی ہیں ان کو چھٹکارا پانے کے ذریعے بھی کم و بیش ترقی یافتہ صورت میں پیداوار کے انہی بدلے ہوئے طریقوں میں موجود ہیں۔ نجات کے ان ذریعوں کو ذہن سے اختراع کرنے کی ضرورت نہیں۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ پیداوار کی موجودہ مادی حقیقتوں میں ذہن کی مدد سے ان کی کھوج لگائی جائے۔

آئیے دیکھیں اس نقطۂ نظر سے سوشلزم کی کیا حیثیت ہے۔

یہ بات تو سبھی ماننے لگے ہیں کہ موجودہ سماج کا ڈھانچہ آج کل کی حاکم جماعت یعنی سرمایہ داروں کا بنایا ہوا ہے۔ پیداوار کا وہ طریقہ جو سرمایہ داروں کے ساتھ مخصوص ہے جسے مارکس کے زمانے سے سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار کہا جانے لگا ہے — جاگیری سماج میں کھپ نہیں سکتا۔ جاگیری سماج میں کچھ لوگوں کو پیدائشی اور مقامی حقوق و مراعات حاصل ہوتے ہیں۔ ذاتی تعلقات کی زنجیر لوگوں کو ایک دوسرے سے باندھے رکھتی ہے۔ سرمایہ داروں نے جاگیری نظام کو برباد کر دیا اور اس کے کھنڈروں پر سرمایہ دارانہ سماجی نظام کی بنیاد رکھی، مسابقت کی آزادی اور نقل و حرکت کی آزادی قائم کی، اجناس تبادلہ کے مالکوں کو مساوی حقوق عطا کئے، اور سرمایہ داری کی دوسری برکتوں کو رواج دیا۔ اسی کے بعد سے سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار کے لئے ترقی کا راستہ کھل گیا۔ بھاپ سے چلنے والے انجن اور کل پرزے بنانے والی نئی مشینیں ایجاد ہوئیں تو پہلے کے کارخانہ داری نظام کے بدلے بڑے پیمانے کی صنعت قائم ہوگئی اور اس طرح سرمایہ داروں کے زیر ہدایت جو پیداآور قوتیں وجود میں آئیں وہ اتنی تیزی سے ترقی کرنے لگیں کہ اس سے پہلے نہ کسی نے دیکھا تھا نہ سنا تھا۔ لیکن جس طرح جاگیرداری نظام میں کارخانہ داری اور دستکاری کو جو اس کے اثر سے بہت آگے بڑھ گئی تھی ہم پیشہ لوگوں کی انجمنوں اور ان کی جاگیری حدبندیوں سے ٹکر لینی پڑی، اسی طرح بڑے پیمانے کی جدید صنعت بھی جب ترقی کرنے لگتی ہے تو ان حدبندیوں سے ٹکراتی ہے جن کے اندر سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار اسے جکڑے رکھتا ہے۔ پیداوار کی نئی قوتیں اب اتنی زیادہ بڑھ چکی ہیں کہ سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار کے اندر ان کی کھپت نہیں ہو سکتی۔

پیداآور قوتوں اور طریقہ پیداوار کی یہ باہمی ٹکر آدم کے گناہِ اولیں اور عدل خداوندی کی باہمی ٹکر کی طرح آدمی کے دماغ کی اُپج نہیں۔ یہ ٹکر ہمارے ذہن سے باہر دنیا کی حقیقتوں میں خارجی وجود رکھتی ہے۔ اور خود ان لوگوں کے ارادوں اور حرکتوں سے بھی آزاد ہے جو اس کے کرتا دھرتا ہیں۔ سوشلزم اس حقیقی نزاع کی پرچھائیں ہے جو ہمارے دماغ کے پردوں پر پڑتی ہے۔ یہ پرچھائیں

اس طبقے کے لوگوں کے دماغ پر بہت صاف چھپی ہے جو اس نظم کی وجہ سے سب سے زیادہ دکھ اٹھاتے ہیں۔ یہ طبقہ محنت کرنے والے مزدوروں کا ہے۔

سرمایہ داری سے پہلے قرون وسطیٰ میں پیداوار بہت چھوٹے پیمانے پر ہوتی تھی۔ پیداوار کا ڈھانچہ اس اصول پر قائم تھا کہ کام کرنے والے خود اپنے ذرائع پیداوار کے مالک ہوا کرتے تھے۔ گاؤں میں چھوٹے کسان، آزاد کاشتکار یا نیم غلام کھیتی کرتے تھے اور شہروں میں دستکاری کا رواج تھا۔ لوگ جن چیزوں پر یا جن کی مدد سے کام کرتے جیسے زمین، کارخانے، کھیتی یا دستکاری کے اوزار وہ سب ایسے ہوتے کہ ان سے ایک ہی آدمی کام کر سکتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ بہت ہلکے پھلکے اور چھوٹے ہوتے اور اسی لئے وہ عام طور سے خود کام کرنے والوں کی ملکیت ہوا کرتے۔ (مثلاً لکڑی کے ہل، کدال، ہتھوڑا وغیرہ۔ مترجم) سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار اور اس کے نمائندے سرمایہ دار طبقے کا یہ تاریخی کارنامہ ہے کہ اس نے ان بکھرے ہوئے اور محدود ذرائع پیداوار کو اکٹھا کیا، انھیں بڑھایا، اور انھیں ترقی دے کر زمانہ حال کی عظیم الشان پیداواری قوتوں میں بدل دیا۔ کارل مارکس نے اپنی مشہور کتاب "سرمایہ" کے چوتھے حصے میں تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ کس طرح پندرہویں صدی سے ذرائع پیداوار کی ترقی کا یہ سلسلہ شروع ہوا اور اب تک تین تاریخی منزلوں سے گزر چکا ہے۔ یعنی ابتدائی صناعت، کارخانہ داری نظام اور بڑے پیمانے کی صنعت۔ لیکن مارکس نے ایک اور بات بھی بتائی۔ سرمایہ داروں نے ان محدود ذرائع پیداوار کو ترقی دے کر بڑی سے بڑی پیداواری قوتوں کو اپنا مطیع بنایا۔ لیکن ایسا کرنے میں ان کے لئے سوا اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ انفرادی ذرائع پیداوار کو بدل کر اجتماعی ذرائع پیداوار کی شکل دے دی جائے جنھیں بہت سے آدمی مل کر ہی کام میں لا سکتے تھے۔ جولاہے کے کرگھے اور چرخے کی جگہ سوت کاتنے اور کپڑا بننے کی بڑی بڑی مشینوں نے لی۔ لوہار کے ہتھوڑے کی جگہ بھاپ سے چلنے والے مشینی ہتھوڑوں کا رواج ہوا۔ اور کاریگروں کی چھوٹی چھوٹی دکانوں کے بجائے بڑی بڑی فیکٹریاں قائم ہونے لگیں۔ جن میں سیکڑوں اور ہزاروں مزدوروں کا ساتھ مل کر کام کرنا ضروری

ہو گیا۔ ذرائع پیداوار کی طرح خود پیداوار نے بھی چولا بدلا۔ اور ایک آدمی یکے بعد دیگرے مختلف کام کرنے کے بجائے اب مسلسل ایک ہی کام انجام دینے لگا۔ حاصل پیداوار اب انفرادی نہیں بلکہ مشترکہ محنت کا ثمرہ ہو گیا۔ فیکٹریوں سے سوت، کپڑے اور دھات کی جو چیزیں تیار ہو کر نکلتیں وہ بہت سے مزدوروں کی ملی جلی محنت کا نتیجہ ہوتیں اور تیار ہونے سے پہلے انھیں یکے بعد دیگرے مختلف مزدوروں کے ہاتھ سے گزرنا پڑتا۔ ان تیار شدہ چیزوں کے بارے میں کوئی ایک آدمی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ میں نے اسے بنایا یا یہ میری محنت کا نتیجہ ہے۔

لیکن جس سماج میں محنت کی تقسیم قدرتی انداز میں آپ ہی آپ ہو جایا کرتی ہو اور یہی پیداوار کی بنیادی صورت ہو وہاں حاصل پیداوار جنس تبادلہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور الگ الگ کام کرنے والے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کا آپس میں تبادلہ کر کے، یعنی خرید و فروخت کے ذریعے اپنی بے شمار ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ عہد وسطیٰ میں سماج کا یہی حال تھا۔ مثلاً کسان اپنے کھیت کی پیداوار کاریگر کے ہاتھ بیچتا اور اس کے بدلے کاریگر کی بنائی ہوئی چیزیں خرید تا۔ پھر اس سماج میں جہاں ہر آدمی الگ الگ کام کرتا اور تبادلے کی غرض سے جنسیں پیدا کرتا، ایک نئے طریقۂ پیداوار نے قدم جمایا۔ قدیم تقسیم محنت کے ساتھ ساتھ جو اس وقت سارے سماج میں پھیلی ہوئی تھی اور جس میں تدبیر کو کوئی دخل نہ تھا اب الگ الگ فیکٹریوں میں باقاعدہ تدبیر کے ساتھ محنت کی تقسیم ہونے لگی۔ انفرادی پیداوار کے ساتھ ساتھ اجتماعی طریقہ پیداوار نے بھی زور پکڑا۔ دونوں طرح کی پیداواریں ایک ہی بازار میں بکتیں اور اس وجہ سے دونوں کا بھاؤ بھی لگ بھگ ایک ہی ہوتا۔ لیکن اگر تدبیر کے تحت محنت کی تقسیم و تنظیم کی جائے تو وہ محنت کی قدرتی تقسیم کے مقابلے میں کہیں زیادہ پائیدار ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے انفرادی پیدا کنندوں کے مقابلے میں وہ فیکٹریاں جہاں اجتماعی محنت سے کام لیا جاتا، زیادہ سستا سامان تیار کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انفرادی پیدا کنندے یکے بعد دیگرے پیداوار کے ہر شعبے میں ہتیار ڈالتے گئے۔ اجتماعی پیداوار نے پیداوار کے پرانے طریقے میں انقلاب برپا کر دیا۔ لیکن لوگوں نے اس انقلاب کی

نوعیت کو بالکل نہیں سمجھا اور اس سے صرف یہ کام لیا گیا کہ بازار میں بکنے والی چیزوں کی پیداوار دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔ ابتدا ہی سے نئے طریقۂ پیداوار کا رشتہ بعض ایسی چیزوں سے جوڑ دیا گیا جو جنس کی پیداوار اور تبادلے میں ممد و معاون تھیں اور پہلے ہی سے موجود تھیں یہ چیزیں تجارتی سرمایہ، دستکاری اور اُجرتی محنت تھی۔ یہ نیا طریقۂ پیداوار چونکہ جنس تبادلہ کی پیداوار کی صورت لے کر آیا تھا اس لئے تصرف کے وہ طریقے جو جنسِ تبادلہ کی پیداوار کے ساتھ مخصوص تھے بدستور اپنی جگہ پر قائم رہے۔

عہدِ وسطیٰ میں جن حالات میں جنس تبادلہ کی پیداوار نے ترقی کی اس میں یہ سوال ہی نہ اٹھ سکتا تھا کہ محنت کی پیداوار کس کی ملکیت ہے۔ پیدا کنندوں نے اپنی انفرادی محنت سے اسے پیدا کیا تھا۔ کچا مال ان کا اپنا اور بسا اوقات اپنی ہی محنت سے پیدا کیا ہوا ہوتا۔ اوزار بھی اُن کے اپنے ہوا کرتے جن سے وہ یا ان کے گھر والے مل کر کام کرتے تھے۔ پیداوار پر انھیں حق ملکیت جتانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اپنی محنت سے پیدا کی ہوئی چیز اپنی نہ ہوگی تو اور کس کی ہوگی؟ غرضکہ اس زمانے میں پیداوار کی ملکیت اپنی محنت پر منحصر ہوتی۔ جہاں کہیں دوسری کی محنت شامل ہوتی وہاں اس کی حیثیت محض ضمنی تھی اور ان کو اُجرت کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی طرح سے معاوضہ دیا جاتا۔ ہم پیشہ لوگوں کی انجمنوں میں شاگرد یا دوسرے لوگ جو اُجرت پر کام کرنے آتے وہ اُجرت اور دو وقت کے کھانے کی خاطر نہیں بلکہ اس لئے کام کرتے تھے کہ کام سیکھ کر خود بھی اچھے کاریگر بن سکیں۔ اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب ذرائع پیداوار کو بڑے بڑے کارخانوں میں اکٹھا کیا جانے لگا اور ان میں ایسی تبدیلیاں ہونے لگیں کہ وہ سچ مچ اجتماعی ذرائع پیداوار بن گئے۔ لیکن اجتماعی ذرائع پیداوار اور اجتماعی محنت کی پیداوار کی حیثیت میں کوئی فرق نہ آیا۔ اب بھی پہلے کی طرح ذرائع پیداوار اور حاصل پیداوار کی انفرادی ملکیت قائم رہی۔ اب تک ذرائع پیداوار کا مالک ہی پیداوار کا مالک بھی ہوتا تھا کیونکہ وہ اس کی اپنی محنت کا نتیجہ تھی۔ اس کی پیداوار میں شاذ و نادر ہی دوسروں کی محنت سے فائدہ اٹھایا جاتا۔ لیکن نئے

حالات میں بھی پیداوار پر ذرائع پیداوار کے مالک کا قبضہ قائم رہا حالانکہ اب وہ اس کی محنت کا نہیں بلکہ سراسر دوسروں کی محنت کا نتیجہ تھی۔ غرضکہ اس طرح چیزیں تو اجتماعی محنت سے پیدا کی جانے لگیں مگر ان پر تصرف ان لوگوں کا نہیں ہوا جنھوں نے دراصل ذرائع پیداوار کو حرکت دی تھی اور چیزوں کو پیدا کیا تھا۔ ان پر ملکیت سرمایہ داروں نے قائم کر لی۔ ذرایع پیداوار اور خود پیداوار کے طریقے بھی اجتماعی ہو چکے تھے۔ لیکن ملکیت کا طریقہ ایسا تھا جس میں پہلے سے ہی یہ مان لیا جاتا کہ افراد الگ الگ پیدا کرتے ہیں، ہر شخص اپنی پیداوار کا مالک ہے اور اسے بازار میں بیچنے لاتا ہے۔ طریقہ پیداوار پر ملکیت کی یہی صورت حاوی تھی حالانکہ طریقہ پیداوار نے ان بنیادوں کو ڈھا دیا تھا جس پر اس کا انحصار ہوتا ہے[۶۴]۔ اسی تضاد کی بدولت نیا طریقہ پیداوار سرمایہ دارانہ رنگ اختیار کر لیتا ہے، اور اسی میں آج کی تمام سماجی نزاع کے جراثیم چھپے ہوئے ہیں۔ یہ نیا طریقہ پیداوار جیسے جیسے ہر ملک میں پیداوار کے ہر اہم شعبے پر حاوی ہوتا گیا اور انفرادی پیداوار کی اہمیت گھٹتے گھٹتے محض آثار قدیمہ کی رہ گئی ویسے ویسے مشترکہ پیداوار اور سرمایہ دارانہ تصرف کا تضاد زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔

ہم بتا چکے ہیں کہ سرمایہ داروں کے آنے سے پہلے بھی اُجرت پر کام کرنے کا دستور موجود تھا۔

---

۶۴ یہاں یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں کہ گرچہ ملکیت کی ظاہری صورت وہی قائم رہتی ہے لیکن اوپر جس طریق عمل کا بیان ہوا اس سے پیداوار کی طرح ملکیت کی نوعیت میں بھی انقلابی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنی محنت سے پیدا کی ہوئی چیزوں پر قبضہ کرنا اور بات ہے اور دوسرے کی محنت سے پیدا کی ہوئی چیز پر قبضہ کرنا اور بات ہے۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بر سبیل تذکرہ ہم یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ اُجرت پر کام کرنے کا دستور (جس کے بطن میں سرمایہ دار طریقہ پیداوار کا تخم پوشیدہ ہے) بہت پرانا ہے۔ منتشر طریقے پر اور مختلف گوشوں میں یہ دستور بھی صدیوں سے دستور غلامی کے ساتھ ساتھ پرورش پاتا رہا ہے۔ لیکن جب ضروری تاریخی حالات پیدا ہو گئے تبھی یہ تخم بڑھ کر سرمایہ دار طریقہ پیداوار کی شکل اختیار کر سکا۔

(اینگلس)

لیکن اگر اجرت پر مشاغل یا صنعت جاری اور مستقل طور پر کام کرتے تھے اور وہ بھی اسی وقت جب اپنی آمدنی میں اوپر سے اضافہ کرنے کی ضرورت آ پڑتی۔ محنت مزدور کبھی کبھار دوسروں کے ہاں اجرت پر کام کرنے نکل جاتا مگر اس کے پاس بھی کچھ نہ کچھ اپنی زمین ضرور ہوتی جس سے وہ وقت ضرورت روزی حاصل کر سکتا تھا۔ ہم پیشہ لوگوں کی انجمنوں کے اصول و ضوابط اس طرح کے ہوتے کہ جو لوگ آج اجرت پر کام کرتے وہ کل خود استاد کاریگر بن جاتے۔ لیکن ذرائع پیداوار نے جیسے ہی اجتماعی شکل اختیار کی اور سرمایہ داروں نے انھیں اپنے ہاتھوں میں جمع کر لیا ویسے ہی یہ حالات بدل گئی۔ چھوٹے چھوٹے انفرادی پیداکنندوں کے ذرائع پیداوار بیکار ہو گئے اور ان کی پیداوار کی قدر گھٹتی گئی۔ اور اب ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ جا کر سرمایہ داروں کے لئے اجرت پر کام کریں۔ مزدوری اجرتی محنت جو پہلے ایک غیر معمولی اور ضمنی چیز تھی اب ایک عام قاعدہ بن گئی۔ اور یہ وہ پیداوار کی سب سے بنیادی صورت تھی۔ پہلے جب اپنی آمدنی میں اوپر سے اضافہ کرنا ہوتا تو کوئی اجرت پر کام کرتا۔ لیکن اب اجرت پر کام کرنے کے سوا محنت کشوں کی روزی کا اور کوئی ذریعہ نہ رہا۔ کبھی کبھار اجرت پر مزدوری کرنے والا آدمی عمر بھر کے لئے اجرتی مزدور بن گیا۔ جاگیری نظام کے ٹوٹ پھوٹ سے تو ان بے حساب اجرتی مزدوروں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہو گیا۔ جاگیرداروں نے اپنے چاکروں کو الگ کرنا شروع کیا اور کسان اپنے گھر بار اور کھیتوں سے بے دخل کئے گئے۔ ایک طرف تو ذرائع پیداوار سمٹ سمٹا کر سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں آ گئے اور دوسری طرف پیداکنندوں کے پاس اپنی اپنی قوت محنت کے سوا اور کچھ نہ رہا۔ اور اس طرح ذرائع پیداوار سے پیداکنندوں کا قطع تعلق مکمل ہو گیا۔ اجتماعی پیداوار اور سرمایہ دارانہ ملکیت کا تضاد مزدوروں اور سرمایہ داروں کی نزاع کی صورت میں سامنے آیا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ سرمایہ دارانہ طرز پیداوار نے ایک ایسے سماج میں زبردستی قدم جمایا جہاں لوگ انفرادی طور پر تبادلہ کے لئے جنس پیدا کرتے تھے اور پیداوار کی اول بدل اس کے سماجی

میل ملاپ کی جان ہوتی تھی۔ لیکن تبادلے کے لئے جنس پیدا کرنے والے تمام سماجوں کی ایک نرالی خصوصیت یہ بھی ہے کہ پیدا کنندوں کا خود اپنے سماجی تعلقات پر کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔ ہر پیدا کنندہ اپنے لئے، اپنے ذرایع پیداوار کی مدد سے، جنس تبادلہ پیدا کرتا ہے اور انھیں بازار میں بدل کر اپنی انفرادی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس نے جو چیز تیار کی اس کی کتنی مقدار بازار میں آنے والی ہے یا بازار میں اس چیز کی مانگ کتنی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس کی پیداوار کی واقعی کسی کو ضرورت بھی ہوگی۔ وہ اس کی لاگت بھی وصول کر سکے گا اور اس کو فروخت بھی کر سکے گا یا نہیں؟ اجتماعی پیداوار میں زراج کا دَور دورہ ہے۔ لیکن پیداوار کے دوسرے طریقوں کی طرح پیداوار جنس کے بھی اپنے مخصوص قانون ہوتے ہیں جو خود اسی کا نتیجہ ہوتے ہیں اور اس سے الگ نہیں کئے جا سکتے۔ اور یہ قانون اس زراج کے باوجود، اسی زراج کے ذریعہ سے اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ ان قوانین کے اظہار کی تنہا صورت وہ سماجی رشتہ ہے جو عملِ تبادلہ میں موجود رہتا ہے۔ یہ قوانین مقابلہ اور مسابقت کے جبری قانون کی حیثیت سے انفرادی پیدا کنندوں پر اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ ابتدا میں تو خود ان پیدا کنندوں کو بھی ان قوانین کی خبر نہیں ہوتی۔ لیکن بہت دنوں کے تجربے کے بعد رفتہ رفتہ انھیں اس کا علم ہونے لگتا ہے۔ یہ قوانین پیدا کنندوں کی مرضی کے بغیر اور ان کے خلاف بھی اپنا کام کرتے رہتے ہیں گویا یہ طریقہ پیداوار کے قدرتی قوانین ہیں جو بلا سوچے سمجھے اپنا کام کرتے ہیں۔ پیداوار پیدا کنندوں پر مسلط ہو جاتی ہے۔

قرونِ وسطیٰ میں اور خصوصاً اس کی ابتدائی صدیوں میں پیدا کنندے اصل میں اپنے استعمال کی چیزیں پیدا کرتے تھے۔ عام طور سے پیداوار کا مقصد یہ ہوتا کہ پیدا کنندہ اور اس کے گھر والوں کی ضرورتیں پوری کی جائیں۔ دیہاتوں میں جہاں کسان جاگیرداروں کے ماتحت ہوتے تھے وہاں اسی پیداوار سے جاگیرداروں کی ضرورتیں بھی پوری کی جاتی تھیں۔ تبادلہ کا کوئی سوال نہ تھا اور جب یہ نہ تھا تو پیداوار بھی جنس تبادلہ کی صورت کیسے اختیار کرتی۔ کسان کا گھرانہ اپنی ضرورت

کی تقریباً تمام چیزیں جیسے کھانا، کپڑا، برتن وغیرہ سب خود پیدا کر لیتا۔ لیکن جب کسان خود اپنی ضرورتوں سے اور جاگیردار کو جتنی پیداوار واجب الادا تھی اس سے زیادہ پیدا کرنے لگا تبھی اس کی پیداوار نے جنس تبادلہ کی صورت اختیار کی۔ یہ فاضل پیداوار بکنے کے لئے بازار میں آئی۔ اب یہ جنس تبادلہ تھی۔ یہ سچ ہے کہ شہر کے کاریگر شروع سے ہی چیزیں تبادلے کے لئے تیار کرتے تھے۔ لیکن وہ لوگ بھی اپنی ضرورت کی اکثر چیزیں خود ہی تیار کر لیتے۔ ان کے پاس اپنے باغ اور چھوٹے چھوٹے کھیت ہوتے۔ وہ اپنے مویشی پنچایتی چراگاہوں میں لے جاتے۔ اپنی پنچایتی جنگلوں سے انھیں جلانے اور سامان بنانے کے لئے لکڑی بھی مل جایا کرتی۔ ان کی عورتیں اون اور سوت کاتتیں۔ تبادلے کی غرض سے سامان تیار کرنے کا دستور، یعنی جنس تبادلہ کی پیداوار ابھی بالکل ابتدائی حالت میں تھی۔ اسی وجہ سے تبادلہ بہت محدود تھا، بازار بہت چھوٹے ہوتے، اور طریقۂ پیداوار ایک حال پر قائم رہتا۔ نہ جانے کتنی چھوٹی چھوٹی دنیائیں آباد تھیں جن کا باہر والوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن ان کے اندر آپس میں پورا ایکا ہوتا۔ دیہاتوں میں پنچایتیں اور شہروں میں ہم پیشہ لوگوں کی انجمنیں ہوا کرتیں۔

لیکن جنسِ تبادلہ کی پیداوار کے بڑھنے اور خصوصاً سرمایہ دارانہ طریقۂ پیداوار کے رواج پانے کے بعد جنس تبادلہ کی پیداوار کے قانون جو اب تک سطح کے نیچے تھے زیادہ قوت کے ساتھ کام کرنے لگے اور سطح کے اوپر آ گئے۔ پرانے رشتوں کی کڑیاں ڈھیلی ہونے لگیں۔ الگ الگ بسی ہوئی دنیاؤں کی چہار دیواریاں ٹوٹنے لگیں۔ پیدا کرنے والے پابندیوں سے آزاد ہوتے گئے اور الگ جنس تبادلہ پیدا کرنے لگے۔ سماجی پیداوار کی طوائف الملوکی نمایاں ہونے لگی اور روز بروز اس کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ لیکن جس ذریعے سے کام لے کر سرمایہ دارانہ طریقۂ پیداوار نے سماجی پیداوار کی طوائف الملوکی میں اضافہ کیا وہ ذریعہ طوائف الملوکی کی براہِ راست ضد تھا۔ وہ طریقہ یہ تھا کہ کارخانوں میں جہاں چیزیں الگ الگ پیدا کی جاتی ہوں پیداوار کی تنظیم اجتماعی بنیاد پر کی جائے۔ یہی وہ ہتیار تھا جس کی مدد سے اس نے پہلے کے پُرامن توازن کو تہ و بالا

کر دیا۔ صنعت کے جس شعبہ میں اس نے قدم رکھا اس میں پیداوار کے پرانے طریقے باقی نہ رہ سکے۔ جہاں اس نے کسی دستکاری کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس کی بیخ کنی کر کے ہی دم لیا۔ محنت کا میدان لڑائی کا میدان بن گیا۔ بڑے بڑے جغرافیائی انکشافات[۶۵] نے نو آبادیات کی راہ دکھائی، ان نو آبادیات کی وجہ سے بازار اور منڈیاں بڑھیں اور دستکاری کو کارخانہ داری میں تبدیل کرنے میں بڑی مدد ملی۔ باہمی کش مکش شروع ہوئی جو کسی ایک جگہ کے پیدا کنندوں میں محدود نہیں رہی۔ مقامی کش مکش بڑھ کر قومی کش مکش میں بدل گئی۔ سترھویں اور اٹھارہویں صدی کی تجارتی لڑائیاں[۶۶] دراصل اسی کا نتیجہ تھیں۔ پھر جب بڑے پیمانے پر صنعتیں قائم ہوئیں اور عالمگیر بازار تیار ہو گیا تو یہ کش مکش بھی عالمگیر ہو گئی اور اس کی شدت میں اتنا اضافہ ہو گیا جتنا اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اس باہمی تقابلے میں پیداوار کی قدرتی یا مصنوعی سہولتوں پر صرف سرمایہ داروں ہی کی نہیں بلکہ پوری پوری صنعتوں اور بڑے بڑے ملکوں کی زندگی اور موت کا انحصار ہے۔ جو اس لڑائی میں گر پڑتا ہے اسے بڑی بے دردی سے اٹھا کر الگ ڈال دیا جاتا ہے۔ ڈارون[۶۷] کا یہ نظریہ کہ ہر جاندار تنازع للبقا میں مبتلا ہے، بڑی شدت کے ساتھ قدرت سے سماج میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ نیا میں جانور جس اصول کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہی اصول

---

۶۵ یہ جغرافیائی انکشافات پندرہویں صدی کے نصف آخر اور سولہویں صدی کے نصف اول میں ہوئے تھے۔ ان میں دو سب سے اہم ہیں ۱۴۹۲ء میں کولمبس نے امریکہ دریافت کیا اور ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما نے ہندستان کے بحری راستے کا پتہ لگایا۔

۶۶ سترھویں اور اٹھارہویں صدی کی تجارتی لڑائیوں میں پرتگال، اسپین، ہالینڈ، فرانس اور انگلستان ایک دوسرے کے حریف تھے۔ لڑائی کی بنیاد یہ تھی کہ ہندستان اور امریکہ کی تجارت کس کے ہاتھ میں ہو اور ان دونوں ملکوں کی لوٹ کس کے حصے میں آئے۔ انگلستان ان لڑائیوں میں جیت گیا۔ اور اٹھارہویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے وہ ساری دنیا کی تجارت پر حاوی ہو چکا تھا۔

۶۷ ڈارون کے نظریے کے مطابق، ارتقا کے اسباب یہ ہیں۔ دو ایک ہی نوع (باقی صفحہ ۹۸ پر)

انسانی ارتقا کے لیے حربۂ آخر کا کام دے رہا ہے۔ الگ الگ کارخانوں کے اندر پیداوار کی باقاعدہ تنظیم کی جاتی ہے مگر بحیثیت مجموعی سماج میں پیداوار کی طوائف الملوکی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ تضاد دراصل اس تضاد کا نتیجہ ہے جو اجتماعی پیداوار اور سرمایہ دارانہ ملکیت میں پایا جاتا ہے

تضاد سرمایہ داری کے خمیر ہی میں ملا ہوا ہے۔ سرمایہ دارانہ طریقِ پیداوار میں تضاد اپنی شدید تر صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس سے چھٹکارا پانا ناممکن ہے۔ یہ ایک پیچ در پیچ چکر ہے جس پر بہت دن ہوئے فوریر کی نظر پڑی تھی۔ البتہ فوریر کو اس زمانے میں یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ چکر دھیرے دھیرے تنگ ہوتا جا رہا ہے اور اس کی حرکت گول نہیں بلکہ بیضاوی ہے اور سیاروں کی حرکت کی طرح ایک نہ ایک دن اپنے مرکز سے ٹکرا کر ختم ہو جائے گی۔ سماج میں پیداوار کی طوائف الملوکی کی وجہ سے لوگوں کی کثیر تعداد مزدور بنتی جا رہی ہے۔ لیکن مزدوروں کی یہی روز افزوں جماعت ایک دن پیداوار کی طوائف الملوکی کا خاتمہ کرے گی۔ بڑے پیمانے کی صنعت میں مشینوں میں برابر ترقی کرتے رہنے کی جو لامحدود صلاحیت ہے وہ پیداوار کی طوائف الملوکی کے ہی دباؤ سے ایک جبری فرمان کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور سرمایہ دار اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ بڑے کارخانے میں نئی سے نئی مشین لگاتا جائے کیونکہ ایسا نہ کرنے سے اسے ہر دم تباہ ہو جانے کا کھٹکا رہتا ہے۔ لیکن مشینوں کو زیادہ مکمل اور بہتر بنانے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی محنت کی ضرورت

(سلسلہ صفحہ ۹۷) کے افراد میں ایسی معمولی تبدیلیوں کا ہونا جو وراثت کے ذریعہ منتقل ہو سکتی ہیں (۲) تنازع للبقا میں ان افراد کی کامیابی جن میں (دوسروں سے) کسی قدر فرق پایا جاتا ہو جس کی وجہ سے وہ زندگی کے حالات سے زیادہ مطابقت پیدا کر سکیں۔ یہی صالح ترین افراد کی بقا کا اصول ہے (۳) ایسے مناسب حال فرق کا وراثت کے ذریعے ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے رہنا اور اس طرح رفتہ رفتہ ان فرقوں کا جو تنازع للبقا میں مفید ہوں ایک جگہ جمع ہو جانا۔ اینگلس نے ایک جگہ لکھا ہے "ڈارون کو کیا معلوم تھا کہ آزاد مسابقت اور تنازع للبقا کو جسے ماہرین معاشیات تاریخ کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں، عالم حیوانی کی طبعی حالت ثابت کر کے اس (ڈارون) نے انسانیت پر اور خصوصاً اپنے ملک پر زبردست طنزیہ چوٹ کی ہے"

کم ہو جائے گی۔ جب مشینیں ایجاد ہوئیں اور پہلے پہل کارخانوں میں لگائی گئیں تو لاکھوں ہاتھ سے کام کرنے والوں کی جگہ تھوڑے سے مشین میں کام کرنے والے مزدوروں نے لے لی تھی۔ اب اگر ان مشینوں کو اور زیادہ مکمل اور بہتر بنایا جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خود مشینوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد اور گھٹا دی جائے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ سرمایہ داروں کو اوسطاً جتنے مزدوروں کی ضرورت ہوتی ہے اس کے مقابلے میں اجرتی مزدوروں کی تعداد بڑھ جائے گی۔ اور جیسا کہ میں نے ۱۸۴۷ء میں کہا تھا اس طرح صنعتی مزدوروں کی ایک "محفوظ فوج" تیار ہو جائے گی جو اس وقت جب کہ کارخانے پوری قوت سے چالو ہوں کام میں لگائے جا سکیں گے۔ لیکن جب بازار مندے ہوں گے تو انھیں کارخانوں سے الگ کر کے سڑکوں پر چھوڑ دیا جائے گا۔ بے روزگار مزدوروں کی یہ کثیر تعداد سارے مزدور طبقے کے لئے جو سرمایہ داروں سے زندگی اور موت کی لڑائی لڑ رہے ہیں، گلے کا ہار بن جائے گی۔ سرمایہ داروں کے ہاتھ میں یہ ایک ایسا مہرہ ہوگا جس سے ضرورت کے مطابق مزدوروں کی اجرت گھٹائی جا سکے۔ غرضکہ اس طرح مشین، کارل مارکس کے قول کے مطابق، مزدوروں کے خلاف سرمایہ داروں کی جنگ میں سرمایہ کا سب سے زبردست ہتھیار بن جاتی ہے۔ یہی آلاتِ محنت مزدوروں کے ہاتھ سے ان کی روزی کا ذریعہ تک چھین لیتے ہیں۔ مزدور کی اپنی محنت کی پیداوار مزدور کو غلام بنانے کے کام آتی۔ صورت یہ ہے کہ آلاتِ محنت کو جس قدر ترقی دی جاتی ہے اسی قدر اور نہایت ناعاقبت اندیشی کے ساتھ مزدوروں کی استعداد محنت ضائع کی جاتی ہے اور محنت کرنے کے لئے جن حالات کی ضرورت ہے انھیں برباد کر دیا جاتا ہے۔ مشین ہی وہ قوت ہے جس کی محنت سے مزدور اور اس کے سب گھر والوں کی زندگی کا ایک ایک لمحہ سرمایہ دار کے رحم و کرم پہ ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے سرمایہ کی قدر میں اضافہ کر سکے۔" (سرمایہ۔ جلد اول۔ صفحہ ۴۴۴)

چنانچہ تھوڑے سے مزدوروں کی شدید محنت پر دوسرے مزدوروں کی بیکاری کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اور بڑے پیمانے کی صنعت جو ساری دنیا میں نئے خریداروں کی کھوج میں

لگی رہتی ہے۔ اپنے دیس کے لوگوں کی قوتِ خرید کم کرتی رہتی ہے حتیٰ کہ فاقہ کشی کی نوبت آجاتی ہے اور اس طرح اس کے اپنے گھر کے بازار برباد ہو جاتے ہیں۔" وہی اقتصادی قانون جو آبادی کے نسبتاً فاضل حصے یعنی صنعتی فوجِ محفوظ کی تعداد میں اور سرمائے کے بڑھنے کی وسعت میں ہمیشہ توازن قائم رکھتا ہے، مزدوروں کو سرمایہ کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ دیتا ہے کہ وُلکن نے پرومیتھیس شلہ کو بھی اس طرح نہ جکڑا تھا۔ جس تیزی سے سرمایہ اکٹھا ہوتا جاتا ہے اسی تیزی سے بپتا بھی بڑھتی جاتی ہے۔ ایک سرے پر دولت اکٹھا ہوتی ہے تو دوسرے پر مشقت اور جہالت، بپتا اور غلامی، ذہنی پستیاں اور بیدردی۔ یہ چیزیں اس طبقے کے حصے میں آتی ہیں جو اپنی محنت کا پھل سرمایہ کی شکل میں پیدا کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ طریقۂ پیداوار سے یہ امید رکھنا کہ پیداوار کسی دوسری طرح بھی بانٹی جائے گی ایسا ہی ہے جیسا بیٹری کے برقی تاروں سے یہ اُمید رکھنا کہ پانی سے متصل ہونے پر وہ اسے تحلیل نہیں کیا کریں گے اور ایجابی سرے پر آکسیجن اور سلبی سرے پر ہائیڈروجن نہیں بننے لگے گی۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ نئی مشینوں میں ترقی کرنے کی جو صلاحیت ہے وہ سماجی پیداوار کی طوائف الملوکی کی بدولت اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ اسے ایک جبری قانون کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ہر صنعتی سرمایہ دار مجبور ہے کہ اپنی مشینوں میں نت نئی اصلاح کرتا رہے اور ان کی پیداواری قوت بڑھاتا رہے۔ اپنے حلقۂ پیداوار کو بڑھانے کا امکان بھی اس کے لئے اسی طرح ایک جبری قانون بن گیا ہے۔ بڑے پیمانے کی صنعت میں پھیلنے کی بڑی زبردست قوت ہے جس

شلہ یونانی دیومالا میں پرومیتھیس ایک نیم دیوتا ہے جس نے چکنی مٹی سے انسان کا پتلا بنایا اور کوہِ اولمپس سے آگ لاکر انسان کو مفید فن سکھائے۔ اس کی پاداش میں وُلکن نے جو آگ کا دیوتا تھا اسے کوہِ قاف سے جکڑ دیا۔ زیوس نے خدا کے حکم سے ایک گدھ دن بھر پرومیتھیس کا گوشت نوچتا رہتا اور رات کو گوشت کے یہ ٹکڑے پرومیتھیس کے جسم میں دوبارہ لگا دیے جاتے۔ ہرکلیس نے اس گدھ کو مار کر پرومیتھیس کو اس ابدی اذیت اور قید سے آزاد کیا۔

کے مقابلے میں گیس کی پھیلنے کی قوت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اور اب یہ قوت ماہیت اور مقدار دونوں طرح کی توسیع کے لئے ایک ضروری قانون کا درجہ اختیار کر لیتی ہے اور کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتی۔ بڑے پیمانے کی صنعت کی پیداوار کے ذریعہ پیداوار کی فروخت اور اس کے بازار ہی یہ دقتیں اور رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ لیکن بازار کے بڑھنے کی صلاحیت سب سے وہ ایک ہی محدود جگہ میں طلب کے بڑھنے کا نتیجہ ہو یا زیادہ وسیع رقبے پر حاوی ہونے کی وجہ سے ہو، بالکل مختلف قوانین کے ماتحت ہے جو بہت کمزور اور بے اثر ہیں۔ پیداوار جس رفتار سے بڑھتی اور ترقی کرتی ہے اس رفتار سے بازار کی گنجائش میں اضافہ نہیں ہوتا۔ آخر کار دونوں ایک نہ ایک دن ٹکراتے ہیں لیکن یہ دشواری اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک کہ سرے سے سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار ہی نہ ختم ہو جائے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۲۵ء کے بعد سے جب کہ پہلی بار عام بحران نمودار ہوا تھا، کساد بازاری کے بے پناہ حملے ہر دس سال کے وقفے سے تمام دنیا کی صنعت و تجارت میں، تمام مہذب قوموں اور ان کی محکوم و کم ترقی یافتہ قوموں کی پیداوار اور تبادلے میں انتشار اور خلل پیدا کرتے رہتے ہیں، تجارت رک جاتی ہے، بازاروں میں چیزوں کی بھرمار ہو جاتی ہے، چیزوں کی کھپت نہیں ہوتی اور وہ گوداموں میں جمع ہوتی چلی جاتی ہیں، نقد روپیہ غائب ہو جاتا ہے، روپیہ کا لین دین ختم ہو جاتا ہے، کارخانے بے کار ہو جاتے ہیں اور بے شمار مزدور دانے دانے کو محتاج ہو جاتے ہیں، کیونکہ انھوں نے ضرورت کی چیزیں ضرورت سے زیادہ پیدا کر لی ہیں! دیوالے پر دیوالہ نکلتا ہے، نیلام پر نیلام ہوتا ہے۔ یہ جمود کئی سال تک قائم رہتا ہے۔ پیداآور قوتیں اور پیداوار بڑی مقدار میں ضائع اور برباد کی جاتی ہیں۔ اور اس طرح برباد کرنے اور اونے پونے بیچ دینے کے بعد جب اجناس کا ڈھیر ختم ہو جاتا ہے تو پیداوار اور تبادلے کا کام رفتہ رفتہ پھر شروع ہوتا ہے۔ بتدریج رفتار تیز ہوتی ہے۔ اب وہ ڈلکی چلنے لگی اور ڈلکی کے بعد سرپٹ۔ اور اس کے بعد صنعت، تجارت مالیات اور سٹہ بازی کی یہ گھوڑدوڑ نہایت مخدوش چھلانگیں بھرتی ہوئی ایک بار پھر تباہی کے

گڑھے میں گر کر ختم ہو جاتی ہے۔ اور بار بار یہی ہوتا رہتا ہے۔ ۱۸۲۵ء سے ہمیں پانچ مرتبہ اس کا تجربہ ہو چکا ہے اور اب (۱۸۷۵ء میں) چھٹی بار اس کا پھر تجربہ ہو رہا ہے۔ اور ان تمام بحرانوں کی نوعیت بالکل غیر شبہ اور ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی ہے۔ فوریر نے سب سے پہلے بحران کے بارے میں کہا تھا کہ یہ افراط کا بحران ہے۔ اسی سے بعد کے سبھی بحرانوں کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے۔

ان بحرانوں کے زمانے میں اجتماعی پیداوار اور سرمایہ دارانہ ملکیت کا باہمی تضاد ایک زبردست دھماکے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس وقت جنسِ تبادلہ کی گردش برائے نام رہ جاتی ہے۔ زر (جس کے ذریعے سے یہ گردش ہوا کرتی تھی) اب گردش کی راہ میں حائل ہو جاتا ہے۔ جنسِ تبادلہ کی پیداوار اور گردش کے تمام قوانین الٹ پلٹ ہو جاتے ہیں۔ معاشی تصادم کی آخری منزل آپہنچتی ہے۔ طریقۂ پیداوار طریقۂ تبادلہ کے خلاف بغاوت کر بیٹھتا ہے۔

بحرانوں کے زمانے میں جب اکثر بڑے اور بے شمار چھوٹے سرمایہ داروں کی تباہی سے سرمایہ ایک مرکز پر جمع ہونے لگتا ہے تو خود سرمایہ داروں کو بھی اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ کارخانوں کے اندر پیداوار کی تنظیم کا اجتماعی طریقہ بہت ترقی کر چکا۔ اور بحیثیت مجموعی سارے سماج کی پیداوار میں جو طوائف الملوکی چھائی ہوئی ہے، جو اس کے پہلو بہ پہلو موجود اور اس پر حاوی رہتی ہے، اس کے ساتھ اب اس (اجتماعی طریقہ) کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ سرمایہ دارانہ طریقۂ پیداوار کے تمام کل پرزے ان پیداآور قوتوں کے بوجھ سے ٹوٹ کر منتشر ہو جاتے ہیں جنھیں خود اسی طریقۂ پیداوار نے پیدا کیا تھا۔ اب ذرائع پیداوار کے اس ڈھیر کو سرمایہ میں منتقل کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ یہ سارا ڈھیر بیکار پڑا رہتا ہے اور اسی وجہ سے صنعتی مزدوروں کی بوقت ضرورت کام آنے والی جماعت بھی بے کار رہتی ہے۔ ذرائع پیداوار، بسر اوقات کے ذریعے، اور مزدور غرضکہ پیداوار کے تمام عناصر بہ افراط موجود ہیں۔ لیکن بقول فوریر "افراط محتاجی اور پریشانی کا سبب بن جاتی ہے"۔ کیونکہ یہی افراط ذرائع پیداوار اور بسر اوقات کے ذریعوں کو سرمایہ بنانے کی شرط

ان کے اور مزدوروں کے درمیان ایک ڈراؤنے بھوت کی طرح حائل ہو جاتی ہے۔ یہی شرط پیداوار کی مادی اور انسانی دونوں قسم کی قوت متحرکہ کو ایک دوسرے سے ملنے نہیں دیتی۔ یہی شرط ذرائع پیداوار کو اپنا کام نہیں کرنے دیتی اور نہ مزدوروں کو کام کرکے اپنا پیٹ پالنے دیتی ہے۔ اس طرح سرمایہ دارانہ طریقۂ پیداوار کی نااہلی ثابت ہو جاتی ہے کیونکہ وہ پیداآور قوتوں کو کام میں لانے سے معذور ہے۔ دوسری طرف یہ پیداآور عناصر خود زیادہ قوت سے آگے بڑھتے ہیں تاکہ اس تضاد کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیں، اپنے بدن سے سرمایہ کا لبادہ اتار پھینکیں، تاکہ ان پیداآور قوتوں کی اجتماعی حیثیت تسلیم کرلی جائے۔

پیداآور عناصر کی زبردست نشوونما، سرمایہ کی خصوصیتوں سے نجات پانے کے لئے ان کی زور آزمائی، اپنی اجتماعی حیثیت کو تسلیم کرانے کی پُرزور کوشش، یہی چیزیں خود سرمایہ دار طبقے کو بھی روز بروز مجبور کر رہی ہیں کہ سرمایہ دارانہ تعلقات کے ڈھانچے کے اندر جہاں تک ممکن ہو ان کے ساتھ اجتماعی پیداآور قوتوں کا سا برتاؤ کریں۔ ایک طرف صنعتی گرم بازاری قرضوں کی غیر معمولی کثرت اور دوسری طرف بحران اور سرمایہ دار کمپنیوں کی تباہی، یہ دونوں حالات ذرائع پیداوار کی بے شمار تعداد کو اجتماعی ملکیت کا رنگ دیتے جا رہے ہیں اور اس کا اظہار مختلف قسم کی مشترک سرمایہ کی (یعنی جوائنٹ اسٹاک) کمپنیوں میں ہوتا ہے۔ ان میں اکثر ذرائع پیداوار اور ذرائع نقل وحمل (جیسے ریلوے) شروع ہی اتنے عظیم الشان پیمانے پر ہوتے ہیں کہ ان کے لئے سرمایہ دارانہ لوٹ کا کوئی اور طریقہ ممکن نہیں رہتا۔ لیکن کچھ دنوں ترقی کرنے کے بعد یہ صورت (یعنی مشترک سرمایہ کی کمپنی) بھی ناکافی ہو جاتی ہے۔

اس وقت پیداوار کی تنظیم کے لئے ٹرسٹ بنائے جاتے ہیں جن میں ملک کی کسی خاص صنعت کے بڑے بڑے کارخانہ دار یکجا ہوتے ہیں۔ یہ لوگ آپس میں یہ طے کر لیتے ہیں کہ اس مخصوص صنعت میں پیداوار کتنی ہونی چاہئے۔ پیداوار کی مقدار متعین کرنے کے بعد یہ لوگ اس مقدار کو آپس میں بانٹ لیتے ہیں اور یہ طے ہو جاتا ہے کہ کون کتنا سامان تیار کرے۔ اور اس طرح سے چیزوں کا

بھاؤ پہلے سے مقرر ہو جاتا ہے۔ لیکن کاروبار کے ماند پڑتے ہی عام طور سے اس قسم کے ٹرسٹ ٹوٹ جایا کرتے ہیں اس لئے سرمایہ داروں کو اپنے اتحاد کی اور مضبوط شکلیں ڈھونڈنی پڑتی ہیں۔ وہ ساری صنعت جس کے لئے یہ ٹرسٹ بنا تھا ایک زبردست جوائنٹ اسٹاک کمپنی ہو جاتی ہے اور باہمی مسابقت کے بجائے یہاں پر ایک کمپنی کی اجارہ داری ہو جاتی ہے، ۱۸۹۰ء میں انگلستان میں انتقلی کی پیداوار کے ساتھ یہی ہوا۔ ۴۸ بڑے بڑے کارخانے آپس میں مل کر ایک ہو گئے اور ان کا انتظام ایک کمپنی کے سپرد ہو گیا جس کا سرمایہ ساٹھ لاکھ پونڈ ہے۔

ٹرسٹوں میں مسابقت کی آزادی اپنی ضد یعنی اجارہ داری کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ سرمایہ دارانہ سماج کا غیر منظم طریقۂ پیداوار آنے والے سوشلسٹ سماج کے منظم طریقہ پیداوار کے سامنے سپر رکھ دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ابتدا میں اس سے سرمایہ داروں ہی کا فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن

---

۶۹ "سرمایہ" میں مارکس نے اجارہ قائم ہونے کے میلان اور تمام تضادوں خصوصاً مقابلہ کے شدید ہو جانے کا محض سرسری تذکرہ کیا تھا۔ مارکس کی وفات کے بعد اینگلس نے اس میلان کو اور بڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بعد سے اجارہ نے بہت زبردست ترقی کر لی ہے اور اب وہ موجودہ زمانے کی سرمایہ داری یعنی سامراجیت کی ایک نمایاں خصوصیت بن گیا ہے۔

سرمایہ داری کی بنیادی خصوصیتوں نے ترقی کر کے اور آگے بڑھ کر سامراجیت کی شکل اختیار کر لی۔ لیکن سرمایہ داری اپنی ترقی کے ایک خاص اور بڑی اعلیٰ منزل پر پہونچ کر ہی سرمایہ دارانہ سامراجیت میں تبدیل ہو سکی۔ اس وقت اس کی بعض بنیادی خصوصیتیں بدل کر اپنی نقیض بن گئیں۔ اور اس دور کی خصوصیات جو سرمایہ داری سے گزر کر ایک بلند تر سماجی اور معاشی نظام میں داخل ہونے کا دور ہے، ہر طرف نمایاں ہونے لگیں۔ اس سلسلے کی سب سے بنیادی معاشی کڑی سرمایہ داری کی آزاد ریاست کے بدلے سرمایہ دارانہ اجاروں کا قیام ہے۔ سرمایہ داری کی اور عام طور سے جنس تبادلہ کی پیداوار کی ایک بنیادی خصوصیت آزاد مقابلہ یا مسابقت ہے۔ اجارہ آزاد مسابقت کی ضد ہے۔ لیکن ہم اپنی آنکھوں سے یہ تماشہ دیکھ رہے ہیں کہ آزاد مسابقت اجارہ داری کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے، بڑے پیمانے کی صنعت (باقی صفحہ ۱۰۵ پر)

اجارہ داری کی منزل پر لوٹ اتنی نمایاں ہو جاتی ہے کہ اس طریقہ کی جلد ہی مخالفت ہونے لگتی ہے۔ کوئی قوم یہ نہیں برداشت کر سکتی کہ پیداوار ٹرسٹوں کی نگرانی میں ہو جن میں نفع بازوں کی ایک چھوٹی سی جماعت اتنی کھلم کھلا لوٹ میں مصروف رہتی ہے۔

بہر صورت، ٹرسٹ ہوں یا نہ ہوں لیکن سرمایہ داری سماج کی سرکاری نمایندہ یعنی ریاست کو ایک نہ ایک دن پیداوار کی نگرانی اپنے ذمہ لینی ہوگی۔ (میں نے "ہوگی" کہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ صرف اُسی وقت جب کہ دولت پیدا کرنے اور اُس کی تقسیم کے ذریعے اتنی ترقی کر جائیں کہ جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں بھی انھیں سنبھال نہ سکیں اور ریاست معاشی طور سے اس بات پر مجبور ہو جائے کہ ان کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے، صرف اُسی وقت اسے معاشی ترقی کہا جا سکتا ہے اور اس منزل کی طرف ایک اور قدم اُٹھتا ہے جہاں پہونچ کر سماج تمام پیداآور عناصر کی نگرانی اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے لیکن جب سے بسمارک[۵۰] نے صنعتی کارخانوں کو سرکاری ملکیت بنانا شروع کیا ہے ایک ناقص اور بے ہودہ قسم کی سوشلزم رائج ہو رہی ہے جو بلا سوچے سمجھے اعلان

(بسلسلہ صفحہ ۱۰۴) کو وجود میں لا رہی ہے اور چھوٹی صنعتوں کی بیخ کنی کرتی جا رہی ہے، اور بڑے پیمانے کی صنعتوں کی جگہ ان سے بھی بڑے پیمانے کی صنعتیں قائم کر رہی ہے۔ اور بالآخر اس سے پیداوار اور سرمایہ کا انتہا درجہ اجتماع وجود میں آتا ہے جس کا نام اجارہ ہے۔ یعنی کارٹل، سنڈیکیٹ اور ٹرسٹ۔ اور ان میں کم و بیش کئی درجہ مینگوں کا سرمایہ بھی آ ملتا ہے جو لاکھوں کروروں پر حاوی ہے۔ لیکن یہ اجارہ جو آزاد مسابقت کے بطن سے پیدا ہوا، اس کا خاتمہ نہیں کرتا، بلکہ اسے قائم رکھتا اور گویا اس پر چھایا رہتا ہے اور اس کی بدولت شدید تصادم جھگڑے اور نزاع ہوتے رہتے ہیں۔ (سامراجیت، سرمایہ داری کی آخری منزل۔ از لینن)

[۵۰] بسمارک (۱۸۱۵ء تا ۱۸۹۸ء) اٹھائیس سال تک جرمنی کا وزیر اعظم۔ جرمن سامراج کو فروغ دینے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ اُس نے جرمنی میں سرمایہ داری کو بہت ترقی دی اور مزدوروں کو دھوکا دینے کے لئے اپنی ہر سرمایہ داری تجویز کو سوشلزم کا نام دیتا۔ وہ مزدوروں کا جانی دشمن تھا۔

کردی ہے کہ تمام سرکاری ملکیت ـــــ بسمارک والی بھی[1] ــــ اشتراکی ہے ۔ اگر تمباکو کی صنعت کو سرکاری ملکیت قرار دینا اشتراکی فعل ہے تو نپولین اور میٹرنک[1] کو سوشلزم کے بانیوں میں شمار کرنا چاہیئے ۔ بلجیم کی حکومت نے بعض سیاسی اور مالی اغراض کی بنا پر اپنے ملک کی ریلوے لائن خود تعمیر کرائی ۔ بسمارک نے جرمنی کی ریلوے لائن سرکاری ملکیت قرار دی تاکہ جنگ کے موقع پر زیادہ سہولت ہو اور ریلوے کے ملازمین سے سرکاری افسروں کی طرح حکومت کی موافقت میں ووٹ دلایا جا سکے اور حکومت کے لئے پارلیمنٹ سے باہر آمدنی کا ایک آزاد ذریعہ قائم کیا جائے ۔ یہ افعال شعوری یا غیر شعوری، براہ راست یا بالواسطہ کسی طور پر بھی اشتراکی نہ تھے ۔ موجودہ سرکاری کارخانے حتی کہ فوجی درزیوں کی سرکاری دکانیں بھی اشتراکی نوعیت کی ہوں گی۔ سرکاری ملکیت بنانے کی ضرورت سب سے پہلے ذرائع رسل و رسائل میں پڑتی ہے ۔ یعنی سب سے پہلے ڈاک خانے، ریلوے اور تار وغیرہ سرکاری ملکیت ہوتے ہیں ۔

اگر بحران نے یہ حقیقت روشن کر دی کہ سرمایہ دار طبقہ جدید پیداآور قوتوں سے کام لینے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو پیداوار اور رسل و رسائل کے بڑے بڑے اداروں کا مشترک سرمائے کی کمپنیوں، ٹرسٹوں اور سرکاری ملکیت کی شکل اختیار کر لینا یہ ثابت کرتا ہے کہ اب سرمایہ دار کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی ۔ جو سماجی خدمت پہلے سرمایہ دار انجام دیا کرتے تھے وہ اب تنخواہ دار ملازم انجام دیتے ہیں ۔ سرمایہ دار کا تو اب صرف یہی کام رہ گیا ہے کہ کمپنی کے حصوں سے جو نفع آئے اسے اپنی جیب میں رکھ لیا کرے ۔ اسٹاک ایکسچینج کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر جوا کھیلا کرے اور آپس میں ایک دوسرے سرمایہ دار کا گلا گھونٹا کرے ۔ جس طرح شروع میں سرمایہ دار طریقہ

---

[1] آسٹریا کا مشہور وزیر خارجہ (۱۷۷۳ء تا ۱۸۵۹ء) جو تقریباً چالیس سال تک یورپ کی سیاست پر حاوی رہا ۔ اس نے نپولین کو شکست دی اور سلطنت آسٹریا کے یورپی جمہوریت کی تمام تحریکوں اور انقلاب کو بڑی بے دردی سے کچلا ۔

پیداوار نے مزدوروں کو بے دخل اور بے کار کیا تھا اسی طرح اب وہ سرمایہ داروں کو بے کار کر دیتا ہے۔ اور وہ مزدوروں کی طرح اگر بیروزگاروں کی صف میں نہیں تو آبادی کے غیر ضروری حصّے میں شامل کر دیے جاتے ہیں۔

لیکن یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ مشترک سرمائے کی کمپنیوں یا ٹرسٹوں یا سرکاری ملکیت کی شکل اختیار کر لینے سے پیداآور قوتوں کی سرمایہ دارانہ نوعیت بدل جاتی ہے۔ مشترک سرمائے کی کمپنیوں اور ٹرسٹوں کے بارے میں تو کسی کو یہ دھوکہ نہیں ہوتا۔ جدید ریاست بھی صرف ایک ایسا ادارہ ہے جسے سرمایہ دار سماج اس غرض سے قائم کرتی ہے کہ سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار کے عام خارجی حالات کو مزدوروں اور انفرادی سرمایہ داروں کی دست برد سے بچائے رکھا جائے۔ جدید ریاست چاہے اس کی شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو، سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ایک آلہ ہے۔ یہ سرمایہ داروں کی ریاست ہے، تمام سرمایہ داروں کی ایک معیاری متحدہ جماعت ہے۔ جتنی زیادہ پیداآور قوتیں ریاست کی ملکیت ہوتی جائیں گی اسی قدر حقیقی معنوں میں وہ سرمایہ داروں کی متحدہ جماعت بنتی جائے گی، اتنے ہی زیادہ باشندوں کو وہ لوٹے گی۔ مزدور بہر حال اُجرتی مزدور رہتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ تعلقات ختم نہیں ہوتے بلکہ اور انتہا کو پہونچ جاتے ہیں۔ مگر اس حد پر پہونچ کر وہ اپنی نقیض بن جاتے ہیں۔ پیداآور قوتوں کی سرکاری ملکیت بجائے خود طبقاتی نزاع کا حل نہیں مگر اس کے اندر اس کو حل کرنے کی صورتیں چھپی ہوئی ہیں۔

یہ حل اسی وقت ممکن ہے جب جدید پیداآور قوتوں کی اجتماعی نوعیت کو عملی طور سے تسلیم کر لیا جائے اور جس طرح ذرائع پیداوار کی نوعیت اجتماعی ہو گئی ہے اسی طرح پیداوار، تبادلہ اور ملکیت کے طریقے بھی اجتماعی قرار دے جائیں۔ اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ سماج کھلم کھلا اور بلا پس و پیش پیداآور قوتوں پر قبضہ کر لے جو اب اتنی ترقی کر چکی ہیں کہ پورے سماج کے علاوہ کوئی دوسرا نہ انھیں سنبھال سکتا ہے اور نہ ان سے کام لے سکتا ہے۔ اس وقت تو یہ حال ہے کہ ذرائع پیداوار کی یہی اجتماعی حیثیت خود اُجروں کے لئے وبالِ جان بنی ہوئی

ہے اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے پیداوار اور تبادلے کے طریقے کو بے کار کر دیتی ہے اور قوانین قدرت کی طرح اندھا دھند اور تشدد کے ساتھ اپنا تخریبی کام کرتی رہتی ہے۔ لیکن سماج کا قبضہ ہو جانے کے بعد انسان ذرائع پیداوار اور پیداوار کی اجتماعی حیثیت سے پوری ہوشمندی کے ساتھ کام لے گا۔ ذرائع پیداوار کی اجتماعی نوعیت کی وجہ سے نہ تو بد نظمی پیدا ہوگی اور نہ وقفہ وقفہ سے بحران آیا کرے گا۔ وہ پیداوار کو بڑھانے کا سب سے زبردست آلہ بن جائے گی۔

اگر ہم ان قوتوں کو جو سماج میں کام کرتی رہتی ہیں نہ سمجھ سکے اور نظر انداز کرتے رہے تو ان کا عمل بھی مذہبی عناصر کی طرح اندھا دھند، تشدد آمیز اور تخریبی ہوا کرے گا۔ لیکن ایک مرتبہ انھیں سمجھ لینے، ان کی حرکات و سکنات سے واقف ہو جانے اور ان کے رجحانات اور اثرات کا پتہ لگا لینے کے بعد یہ بات ہماری اپنی مرضی پر منحصر ہوتی ہے کہ ہم ان قوتوں سے کس طرح اور کتنا کام لیں اور ان کی مدد سے اپنے مقاصد کیوں کر پورے کریں۔ اور خصوصاً آج کل کی پیدا آور قوتوں کے بارے میں یہ بات حرف بحرف درست ہے۔ جب تک ہم اپنی ضد پر اڑے رہیں گے اور پیدا آور قوتوں کی اصل فطرت اور کردار سے واقف ہونے کی کوشش نہیں کریں گے (اور سرمایہ دار طریقۂ پیداوار اور اس کے حامی اس کوشش میں حایل ہیں) اس وقت تک یہ قوتیں ہم سے بے پروا ہو کر ہمارے خلاف اپنا کام کرتی رہیں گی لیکن جہاں ایک بار ان کی اصل فطرت پر عبور ہو گیا تو پھر یہی قوتیں عفریت پیکر آقاؤں کے بجائے ساتھ مل کر کام کرنے والے مزدوروں کی مطیع اور فرمانبردار کنیز بن جائیں گی۔ بجلی وہ بھی ہے جو آسمان سے گرتی ہے اور خرمنوں کو بھسم کرتی ہے اور وہ بھی ہے جو بجلی گھر میں پیدا ہوتی اور رات کی تاریکیوں کو روشن کرتی ہے۔ آگ جھونپڑیوں کو جلاتی بھی ہے اور جھونپڑیوں کے بسنے والوں کو آرام بھی پہنچاتی ہے۔ لیکن دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہی حال سماجی قوتوں کا ہے۔ یہ سمجھ لینے کے بعد اس بات کا امکان پیدا ہو جاتا ہے کہ پیداوار کی طوائف الملوکی کو دور کیا جا سکے اور اس کی جگہ پر بحیثیت مجموعی پورے سماج اور الگ الگ

ہر فرد دونوں کی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہوئے ایک اجتماعی تدبیر کے مطابق پیداوار کا انتظام کیا جاسکے۔ سرمایہ دار طرز ملکیت کے بجائے (جہاں پیداوار پہلے پیدا کرنے والے مزدوروں کو اور بعد میں خود پیداوار پر قبضہ کرنے والے سرمایہ داروں کو اپنا غلام بناتی ہے) اب پیداوار کی ملکیت کا ایک ایسا طریقہ رائج ہوگا جو جدید ذرائع پیداوار کی اصل فطرت کے مطابق ہو۔ ایک طرف براہِ راست سماج کی ملکیت ہوگی تاکہ سلسلہ پیداوار کو قائم رکھا اور بڑھایا جائے اور دوسری طرف براہِ راست الگ الگ افراد کی ملکیت ہوگی جس سے وہ اپنی ضرورتیں پوری کریں گے اور آرام سے زندگی بسر کریں گے۔

آبادی کی بڑی اکثریت کو روز بروز اُجرت پر کام کرنے والا مزدور بنا کر سرمایہ دارانہ طریقۂ پیداوار ایک ایسی قوت پیدا کرتا ہے جو تباہی سے بچنے کے لئے انقلاب کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ بے شمار اجتماعی ذرائع پیداوار کو سرکاری ملکیت بنا کر خود سرمایہ دارانہ طریقۂ پیداوار اس انقلاب کے لئے رستہ صاف کرتا ہے۔ مزدور طبقہ ریاست پر قبضہ کرے گا اور سب سے پہلے ذرائع پیداوار کو ریاست کی ملکیت بنا دے گا۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ خود اپنی طبقاتی حیثیت کو، طبقاتی فرق اور طبقاتی لڑائیوں کو اور خود ریاست کو بحیثیت ریاست کے مٹا دے گا۔ پچھلی سماج کو جو طبقاتی اختلافات کے دائرے میں گھومتی رہتی تھی ریاست کی ضرورت تھی۔ یعنی ہر دور میں لوٹنے والے طبقوں کو ایک ایسے ادارے کی ضرورت تھی جو پیداوار کے خارجی حالات کو برقرار رکھ سکے۔ اسی کی مدد سے لوٹے جانے والے طبقے کو مظلومی کی کسی خاص حالت (جیسے غلامی، زرعی غلامی، اُجرتی محنت) میں جو مروجہ طریقۂ پیداوار کے تحت ممکن ہوتی، زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا۔

ریاست سارے سماج کی مستند نمائندہ تھی، ایک ہیئت اجتماعیہ کی شکل میں اس کا مرئی اظہار تھی۔ لیکن اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ ریاست اس طبقے کی تھی جو اس عہد

میں سارے سماج کی نمائندگی کر رہا تھا۔ عہد قدیم میں ریاست غلام دار شہریوں کی تھی۔ قرون وسطیٰ میں جاگیردار روساکی اور بعد میں ہمارے زمانے میں سرمایہ داروں کی۔ لیکن آخر کار جب ریاست سچ مچ پوری سماج کی نمائندہ بنتی ہے تو اس وقت اُس کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ کوئی ایسا طبقہ ہی باقی نہیں رہتا جس کو محکوم بنا کر رکھا جائے۔ طبقاتی تسلط اور انفرادی تنازع للبقا جو پیداوار کی طوائف الملوکی پر مبنی ہوتی ہے اور اسی کے ساتھ اس کے بطن سے پیدا ہونے والے جھگڑے اور تصادم اور زیادتیاں سب ختم ہو جاتی ہیں۔ کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہتی جس پر جبر کیا جائے اور اس لئے کسی خاص جبری قوت یعنی ریاست کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔ ریاست کی پہلی خدمت جس میں وہ درحقیقت پورے سماج کی نمائندہ بن کر سامنے آتی ہے، سماج کے نام پر تمام ذرائع پیداوار پر قبضہ کرنا ہے لیکن ریاست کی حیثیت سے یہی اس کی آخری خدمت ہے۔ سماجی تعلقات میں ریاست کی مداخلت غیر ضروری ہوتی ہے، اور بالآخر خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ آدمیوں پر حکومت کرنے کے بجائے معاملات کا نظم و نسق، پیداوار کا انتظام اور ان کی نگرانی ہونے لگتی ہے۔ ریاست کا یکایک "انسداد" نہیں ہوتا۔ اس کا پودا رفتہ رفتہ خود سوکھ جاتا ہے۔ "آزاد عوامی ریاست"[۱] کے نعرے پر بھی اسی

---

۱ ۔ گوتھا پروگرام نے مزدور جماعت کا مقصد ایک "آزاد عوامی ریاست" قائم کرنا قرار دیا تھا۔ اس پر تنقید کرتے ہوئے اینگلس نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ "آزاد عوامی ریاست، ایک لغو اور بے معنی فقرہ ہے۔ مزدور طبقہ ریاست سے جتنے دن بھی کام لیتا ہے وہ آزادی کی خاطر نہیں بلکہ اپنے دشمنوں کا سر کچلنے کے لئے اور جیوں ہی آزادی کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ ویسے ہی ریاست کی حیثیت سے ریاست کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔"

اینگلس۔ خط بنام بے بل۔ مورخہ ۱۸ / ۲۸ مارچ ۱۸۷۵ء

اور سست رفتاری کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ سماج میں الگ الگ طبقے ہوں، ایک طبقہ لوٹے اور دوسرا لوٹا جائے، ایک حکومت کرے اور دوسرا اس کا محکوم ہو۔ جب تک سماج کے تمام افراد یا افراد کی بہت بڑی اکثریت کو تقریباً اپنا سارا وقت محنت میں صرف کرنا پڑتا ہے، اس وقت تک سماج کا طبقوں میں بٹا رہنا ضروری تھا۔ اس بڑی اکثریت کے پہلو بہ پہلو جو ہر وقت محنت میں مصروف رہتی تھی ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جو ہر قسم کی محنت سے آزاد تھا اور جو سماج کے عام معاملات کی دیکھ بھال کرتا تھا، مثلاً مزدوروں سے کام لینا، ریاست کے معاملات، عدل و انصاف، سائنس اور آرٹ اور اسی طرح کی دوسری خدمتیں انجام دیا کرتا تھا۔ اس طرح طبقاتی تقسیم کی بنیاد تقسیم عمل کے اصول پر تھی۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ طبقاتی تقسیم کی بنیاد رکھنے میں تشدد، ڈکیتی، دھوکا اور چالبازیوں سے کام نہیں لیا گیا۔ حکمراں طبقہ ایک مرتبہ سنگھاسن پر بیٹھ جانے کے بعد مزدور طبقے کو نقصان پہنچا کر اپنا اقتدار بڑھانے سے نہیں چوکا۔ گڈریے نے گلے کی رکھوالی کی لیکن اس کا خون بھی پیا۔

اس بنا پر مانا کہ سماج کی طبقاتی تقسیم کے لئے ایک تاریخی جواز تھا لیکن ہمیشہ کے لئے نہیں بلکہ ایک خاص مدت کے لئے اور خاص سماجی حالات کے اندر۔ اس تقسیم کا سبب یہ تھا کہ پیداوار کافی نہیں تھی۔ لیکن جدید پیداآور قوتوں کی پوری ترقی کے بعد سماج کی طبقاتی تقسیم کے لئے کوئی جواز باقی نہیں رہے گا۔ اس تقسیم کی بیخ کنی ہو جائے گی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ سماج کی طبقاتی تقسیم کو مٹانے کے لئے تاریخی ارتقا سے گزر کر ایک ایسی منزل پر پہنچنا ضروری تھا جہاں کوئی ایک حکمراں طبقہ نہیں بلکہ تمام حکمراں طبقے یعنی خود طبقاتی اختلاف ہی سرے سے بے جوڑ اور اور ازکار رفتہ ہو جائے۔[۵۴۳] لیکن اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ پیداوار اتنی ترقی کر چکی ہو کہ ذرائع پیداوار اور پیداوار پر کسی خاص طبقے کا قبضہ اور تصرف اور اس کے ساتھ اس

---

۵۴۳ جمہوریۂ سوویت میں مزدور طبقے کی آمریت کے ذریعہ سے طبقوں کا انسداد ہوتا جا رہا ہے۔ جمہوریۂ سوویت کی کمیونسٹ پارٹی کی سترھویں کانگرس نے دوسرے پنج سالہ پروگرام کا مقصد لیتے ہوئے طبقوں (باقی صفحہ ۱۱۲ پر)

روشنی میں غور کرنا چاہیے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو وہ نعرہ تبلیغی مقاصد کے لئے تو جائز ہے مگر سائنٹفک اعتبار سے بنیادی غلطیوں کا حامل ہے۔ پھر اسی نقطۂ نظر سے ہمیں تراجیت پسندوں ۲۷؎ کے اس مطالبے پر غور کرنا چاہیے کہ چشم زدن میں ریاست کا انسداد کر دیا جائے۔

جب سے دنیا میں سرمایہ دارانہ طریقۂ پیداوار کا ظہور ہوا اسی وقت سے بعض افراد اور جماعتیں ایسی سماج کا خواب دیکھتی آئی ہیں جس میں تمام ذرائع پیداوار خود سماج کی ملکیت ہوں۔ لیکن ان کے یہ خواب ہمیشہ دھندلے رہے اور کبھی خیالی منصوبوں سے آگے نہیں بڑھنے پائے۔ ایسا سماج صرف اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے، صرف اسی وقت اس کی تاریخی ضرورت پیدا ہو سکتی ہے جب وہ مادی حالات پیدا ہو گئے ہوں جن میں اسے عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ سماجی ترقی آدمیوں کے یہ محسوس کر لینے سے نہیں ممکن ہو جاتی کہ مختلف طبقوں کا وجود انصاف اور مساوات کے خلاف ہے اور نہ سماجی ترقی کے لئے صرف اس ارادے کی ضرورت ہوتی ہے کہ ان طبقات کو مٹا دینا چاہیے۔ اس کے لئے ضرورت ہوتی ہے بعض نئے معاشی حالات کی۔ آج سے پہلے تک پیداوار کی پسماندگی

۲۷؎ پرودھوں اور باکونین وغیرہ تراجیت پسند تھے۔ لیکن وہ ریاست کی نوعیت کو سمجھنے سے قاصر رہے انقلابی حکومت کی ضرورت اور اہمیت کے منکر تھے۔ نتیجۃً مزدور طبقہ اقتدار حکومت سے کیا انقلابی کام لے سکتا ہے یہ ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ریاست چشم زدن میں مٹا دی جائے۔ اور اس لئے مزدور طبقے کی آمریت کے خلاف انھوں نے "نظریاتی" اور اب ان کے ماننے والوں نے عملی، جدوجہد شروع کی۔

طبقے کی سیاسی حکمرانی، تعلیم و تہذیب کی اجارہ داری نہ صرف غیر ضروری اور فضول ہو جائے بلکہ اس سے معاشی، اور سیاسی اور علمی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہونے لگیں۔

اب یہ وقت آگیا ہے۔ خود سرمایہ داروں کو بھی اب اپنے سیاسی دیوالیہ پن اور ذہنی کھوکھلے پن کا احساس ہو گیا ہے اور ان کا معاشی دیوالہ تو ہر دسویں سال پابندی کے ساتھ نکلتا رہتا ہے ہر معاشی بحران کے زمانے میں سماج خود اپنے ہی پیدا آور عناصر اور پیداوار کے بوجھ سے دب جاتی ہے۔ وہ ان سے کام نہیں لے سکتی۔ اور بے بسی کی حالت میں کھڑی اس مہمل تضاد کا نظارہ دیکھتی رہتی ہے کہ پیدا کرنے والوں کے پاس صرف کرنے کو کچھ نہیں کیونکہ صرف کرنے والا کوئی نہیں! ذرائع پیداوار کی پھیلتی اور بڑھتی ہوئی قوت ان زنجیروں کو توڑ پھینکتی ہے جو سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار نے اسے پہنا رکھی ہے۔ پیدا آور قوتوں کی مسلسل اور مستقل اور روز بروز تیز ہونے والی ترقی اور پیداوار کی لامحدود افزائش کی واحد شرط یہ ہے کہ پیدا آور قوتوں کو ان بیڑیوں سے چھٹکارا ملے۔ لیکن ان بیڑیوں کے ٹوٹنے کے اثرات یہیں تک محدود نہیں ہیں۔ ذرائع پیداوار پر سماج کا قبضہ ہو جانے کے بعد نہ صرف پیداوار کی موجودہ بناوٹی پابندیاں دور ہو جائیں گی بلکہ پیداوار اور پیدا آور قوتیں ضائع ہونے سے بھی بچ جائیں گی۔

(بسلسلہ صفحہ ۱۱۰) کا مکمل انسداد اور ایک بے طبقہ سماج کا قیام قرار دیا تھا۔ اس کام کو ایک نہایت شدید طبقاتی جدوجہد کے ذریعہ ہی پورا کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے ریاست یعنی مزدور طبقے کی آمریت کو برقرار رکھنے ہی کی نہیں بلکہ مزید تقویت پہنچانے اور ترقی دینے کی ضرورت ہے۔

"ہم ریاست کے تدریجی زوال کے حق میں ہیں۔ پھر بھی ہم مزدور طبقے کی آمریت کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں جو اب تک تمام قسم کی ریاستوں میں سب سے زیادہ طاقتور اور زبردست ہے۔ ہمارا مدعا یہ ہے! ریاست کے تدریجی زوال کے حالات پیدا کرنے کے لئے ریاست کی طاقت کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے۔ کیا یہ بات متضاد نہیں ہے؟ ہاں۔ اس میں ایک تضاد ہے لیکن یہ تضاد ایک زندہ حقیقت ہے اور مارکسی جدلیات کا پورا پورا عکس ہے"

(لینن ازم۔ از۔ اسٹالین۔ جلد دوم صفحہ ۳۵۲)

ہوا ان و زن و اجناس کی بربادی جو بحران کے زمانے میں، پیداوار کا ہی عنصر ہوا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ سماج کا قبضہ ہو جانے کے بعد آج کل کے حاکم طبقوں اور ان کے سیاسی نمائندوں کی بیہودہ اور فضول خرچیوں اور عیاشیوں کا بھی خاتمہ ہو جائے گا اور اس طرح پیداوار اور ذرائع پیداوار کا ایک بڑا حصہ سماج کے قبضہ میں آ جائے گا۔ اب پہلی بار اس بات کا امکان پیدا ہوا ہے کہ اجتماعی پیداوار کی بدولت سماج کا ہر فرد ایسی زندگی بسر کرے کہ نہ صرف اس کی مادی ضرورتیں اچھی طرح پوری ہوتی ہوں، بلکہ ایسا ماحول بھی پیدا ہو جس میں ہر آدمی اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو پوری آزادی کے ساتھ ترقی دے سکے اور کام میں لا سکے۔*

ذرائع پیداوار پر سماج کا قبضہ ہوتے ہی جنس تبادلہ کا پیدا ہونا بند ہو جائے گا۔ اور اس کے ساتھ دولت پیدا کرنے والے پر پیداوار کا تسلط بھی ختم ہو جائے گا۔ سماجی پیداوار کی

---

* گذشتہ سرمایہ داری کے بوجھ سے دبے ہونے پر بھی جدید ذرائع پیداوار میں ترقی کرنے کی کتنی زبردست صلاحیت ہے، اس کا اندازہ چند اعداد و شمار سے ہو جائے گا۔ گیفن کے تازہ ترین تخمینہ کے مطابق برطانیہ اور آئرلینڈ کی پوری دولت

۱۸۱۴ء	میں	دو ارب بیس کروڑ پونڈ تھی
۱۸۶۵ء	میں	چھ ارب دس کروڑ پونڈ تھی
۱۸۷۵ء	میں	آٹھ ارب پچاس کروڑ پونڈ تھی

بحرانوں میں ذرائع پیداوار اور پیداوار کس قدر برباد ہوتے ہیں اس کا اندازہ کچھ اس سے ہو سکتا ہے کہ دوسری جرمن صنعتی کانگرس (منعقدہ برلن، ۲۱ فروری ۱۸۷۸ء) کے تخمینے کے مطابق پچھلے بحران میں جرمنی کو صرف لوہے کی صنعت میں چوالیس کروڑ پچاس لاکھ مارک یعنی دو کروڑ تیس لاکھ پچاس ہزار پونڈ کا نقصان ہوا تھا۔ (نوٹ از اینگلس)

سامراجیت یعنی سرمایہ داری کی آخری اور بلند ترین منزل میں پیداواری قوتوں کی مزید ترقی کے بارے میں لینن لکھتا ہے، "اجارے، ایک مٹھی بھر گروہ کی حکومت، آزادی کے بجائے غلبہ اور استحصال

طوائف الملوکی بھی دور ہو جائے گی ۔ اس کے بدلے پوری ہوشمندی اور تدبیر کے ساتھ پیداوار کی تنظیم کی جائے گی ۔ اپنی اپنی بقا کے لئے افراد کی باہمی کشمکش ختم ہو جائے گی اور ایک اعتبار سے انسان دوسرے حیوانات سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کرے گا اور زندگی کی درندگیوں سے چھٹکارا پا کر حقیقی معنی میں انسانی زندگی میں قدم رکھے گا ۔ انسانی زندگی کا وہ ماحول جس نے اب تک انسان پر حکومت کی اب انسان کے ماتحت ہو جائے گا ۔ انسان پہلی بار اشرف المخلوقات بنے گا ۔ وہ قدرت پر فرمانروائی کرنے لگے گا کیونکہ اپنی سماجی تنظیم پر اب اس کی فرماں روائی قائم ہو چکی ہوگی ۔ انسانی سماج کے وہ قانون جو اب تک انسان پر اس طرح حکومت کرتے تھے گویا وہ

(بسلسلہ صفحہ ۱۱۴) کی کوشش، گنتی کے چند نہایت دولت مند اور طاقتور قوموں کے ہاتھوں چھوٹی یا کمزور اقوام کی کثیر اور روز افزوں تعداد کا لوٹا جانا، انہی سے سامراجیت کی وہ مخصوص صفات پیدا ہوتی ہیں جن کی بدولت ہم اسے دوسروں کے بل پر جینے والی یا جاں بلب سرمایہ داری کہتے ہیں ۔ سامراجیت کا ایک رجحان روز بروز زیادہ نمایاں ہوتا جا رہا ہے اور وہ ہے سماجی یا سود خور ریاست کا طور جس میں سرمایہ دار طبقہ، سرمایہ برآمد کر کے اس کی آمدنی پر اور سٹہ بازی کے ذریعے زندگی بسر کرتا ہے لیکن زوال کے اس رجحان سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ سرمایہ داری کی ترقی کے امکانات ختم ہو چکے ۔ ایسا نہیں ہے ۔ سامراجیت کے عہد میں بعض صنعتوں میں سرمایہ داروں کی بعض جماعتوں میں اور بعض ملکوں میں ان دونوں (یعنی زوال یا تیز ترقی کے رجحانوں) میں سے کوئی نہ کوئی رجحان کسی حد تک ضرور پایا جاتا ہے ۔ بحیثیت مجموعی سرمایہ داری پہلے سے کہیں زیادہ تیزی سے ترقی کر رہی ہے ۔ لیکن اولاً تو یہ ترقی روز بروز زیادہ ناہموار ہوتی جا رہی ہے ۔ اور پھر یہی نہیں ۔ یہ ناہمواری خاص طور پر یوں ظاہر ہوتی ہے کہ جو ملک سرمایہ کے اعتبار سے سب سے دولت مند ہیں (جیسے انگلستان) ان کا زوال ہونے لگتا ہے ۔"

(از منتخبات لینن ۔ پانچویں جلد ۔ سامراجیت، سرمایہ داری کی آخری منزل ۔ صفحہ ۱۱۶-۱۱۵)

قدرت کے قانون ہی انسان کے تابع ہو جائیں گے۔ انسان ان سے اچھی طرح سمجھ بوجھ کر کام لیا کرے گا۔ انسان کی اپنی سماجی تنظیم (جو اب تک اس کی حریف بنی رہی گویا وہ قدرت یا تاریخ کے کسی من مانے فرمان کا نتیجہ تھی) اب انسانوں کے اپنے رضاکارانہ عمل کا نتیجہ ہو گی۔ وہ حقیقی، خارجی قوتیں جو اب تک تاریخ پر حاوی رہی ہیں، اب خود انسان کی اطاعت کرنے لگیں گی)۔ اسی وقت سے انسان جان بوجھ کر اور اپنے ارادے کے تحت آپ اپنی تاریخ بنائے گا۔ اسی وقت سے انسان خود سماجی قوتوں سے کام لینے لگے گا اور ان قوتوں کے نتائج بھی روز بروز بڑی حد تک اس کی خواہش کے مطابق ہوتے جائیں گے۔ یہ ہو گی انسانیت کی جست، احتیاج سے اختیار کی طرف!

ارتقا کے ان مدارج کا خلاصہ یہ ہے :-

۱۔ ازمنۂ وسطیٰ کا سماج —— چھوٹے پیمانے پر انفرادی پیداوار۔ آلہ جات پیداوار آدمیوں کے انفرادی استعمال کے مطابق ہوا کرتے تھے اس لئے بہت بھدے، چھوٹے اور ہلکے پھلکے ہوتے تھے۔ پیدا کرنے والا خود اپنے یا اپنے جاگیردار آقا کے فوری استعمال کے لئے چیزیں پیدا کرتا تھا۔ اگر کبھی پیداوار صرف (استعمال) سے زائد ہوتی تو یہ زائد حصہ بازار میں بیچنے کے لئے لایا جاتا۔ جنس تبادلہ کی پیداوار بھی اپنی ابتدائی منزل میں تھی۔ لیکن سماجی پیداوار کی طوائف الملوکی کے جراثیم اس کے اندر موجود تھے۔

۲۔ سرمایہ دار انقلاب —— ابتدائی میل جول اور کارخانہ داری کی بدولت صنعت میں تبدیلی ہونے لگتی ہے۔ ذرائع پیداوار، جو اب تک بکھرے ہوئے تھے، بڑے بڑے کارخانوں میں یکجا ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انفرادی ذرائع پیداوار کے بجائے اجتماعی ذرائع پیداوار بن جاتے ہیں۔ اس تغیر کا بحیثیت مجموعی طریقۂ تبادلہ پہ کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ملکیت کی پرانی صورتیں بدستور قائم رہتی ہیں۔ سرمایہ دار کا ظہور ہوتا ہے۔ وہ ذرائع پیداوار کا مالک ہے، اس لئے پیداوار پر بھی قبضہ کر لیتا ہے اور انہیں جنس تبادلہ بنا دیتا ہے۔ پیداوار ایک اجتماعی عمل کی حیثیت اختیار کر چکی ہے لیکن تبادلہ کرنے اور تصرف میں لانے کے افعال، اب تک انفرادی ہیں

یعنی انھیں الگ الگ افراد انجام دیتے ہیں۔ اجتماعی پیداوار پر انفرادی سرمایہ دار قبضہ کر لیتے ہیں۔ یہی بنیادی تضاد ہے جس سے وہ تمام دوسرے تضاد پیدا ہوتے ہیں جن کے حلقے میں موجودہ سماج گردش کرتا ہے اور جن کے خدوخال کو جدید صنعت نے بہت روشن اور نمایاں کر دیا ہے۔

(ل) پیدا کرنے والا ذرائع پیداوار سے الگ ہو جاتا ہے۔ مزدور تمام عمر اُجرت پر کام کرنے پر مجبور ہے۔ مزدور طبقے اور سرمایہ دار طبقے کی دشمنی۔

(ب) اُن قوانین کا اثر بڑھتا ہے جو جنس کی پیداوار پر حاوی ہوتے ہیں۔ بے عنان سابقت کا دَور شروع ہوتا ہے۔ کارخانوں کی اجتماعی تنظیم اور پیداوار کی بحیثیت مجموعی طوائف الملوکی میں تضاد۔

(ج) ایک طرف سابقت کی وجہ سے مشینوں کو بہتر بنانا انفرادی کارخانہ داروں کے لئے ایک جبری قانون بن جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ مزدوروں کی ایک بڑھتی ہوئی تعداد کام سے الگ کی جاتی ہے۔ یہ صنعت کی محفوظ فوج ہے۔ دوسری طرف پیداوار کی غیر محدود توسیع بھی ہر کارخانہ دار کے لئے سابقت کا ایک جبری قانون ہے۔ ہر طرف پیداآور قوتوں کی غیر معمولی ترقی جو کبھی کسی نے سُنی نہ ہو، طلب سے زیادہ رسد۔ فاضل پیداوار۔ بازار کا چیزوں سے بھر جانا۔ ہر دسویں سال صناعتی بحران۔ ایک اَبدی چکر، ایک طرف ذرائع پیداوار اور پیداوار کی افراط ہے۔ دوسری طرف مزدوروں کی افراط ہے جن کا نہ کوئی سلسلہ روزگار ہے اور نہ جن کے پاس کوئی رزق کا سامان ہے۔ لیکن یہ دونوں عناصر جو پیداوار اور سماجی بہتری میں اضافہ کر سکتے تھے، یکجا ہو کر کام نہیں کر سکتے۔ کیونکہ سرمایہ دار طریقۂ پیداوار پیداآور قوتوں کو کام کرنے سے روکتی ہے اور پیداوار کو گردش میں نہیں آنے دیتی جب تک وہ پہلے سرمایہ نہ بن جائے۔ لیکن پیداوار کی افراط کی حالت میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ تضاد بڑھ کر لغزیت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ طریقۂ پیداوار طرزِ تبادلہ کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اب سرمایہ دار طبقہ خود اپنی پیداآور قوتوں کا انتظام کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

(د) خود سرمایہ داروں کو مجبور ہو کر پیداآور قوتوں کی اجتماعی نوعیت کو کسی حد تک تسلیم کرنا کرنا پڑتا ہے۔ پیداوار اور نقل وحمل کے بڑے بڑے ادارے پہلے مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں اور پھر ٹرسٹوں اور آخر میں ریاست کے سپرد کر دیے جاتے ہیں۔ یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ سرمایہ دار طبقہ ایک عضوِ معطل ہے۔ اس کے تمام سماجی فریضے اب اس کے تنخواہ دار ملازم انجام دیا کرتے ہیں۔

۳۔ مزدور انقلاب ـــــ تضاد کا حل، مزدور طبقہ ریاستی اقتدار پر قبضہ کر لیتا ہے۔ اور اس اقتدار کی مدد سے اجتماعی ذرائع پیداوار کو جو سرمایہ داروں کے ہاتھ سے کھسکتے جا رہے تھے، پنچائتی ملکیت قرار دیتا ہے۔ ایسا کر کے مزدور طبقے نے ذرائع پیداوار کو سرمایہ کی خصوصیات سے جن کا وہ اب تک حامل تھا، آزاد کر دیا۔ وہ ذرائع پیداوار کی اجتماعی نوعیت کو پروان چڑھنے کا پورا موقع دیتا ہے۔ اب اجتماعی پیداوار کسی باقاعدہ لائحہ عمل کے مطابق ہوتی ہے۔ پیداوار کے ترقی کرنے کی وجہ سے سماج میں مختلف طبقوں کا وجود اب بے جوڑ ہو جاتا ہے۔ جیسے جیسے سماجی پیداوار کی طوائف الملوکی دُور ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے ریاست کا سیاسی اقتدار بھی ختم ہوتا جاتا ہے۔ اور انسان بالآخر اپنی سماجی تنظیم کا مالک بنتا ہے اور اسی کے ساتھ قدرت پر بھی اس کی فرماں روائی قائم ہو جاتی ہے۔ وہ آپ اپنا مالک یعنی آزاد ہو جاتا ہے۔

دنیا کو آزاد کرانے کا تاریخی کام جدید مزدور طبقے کے حصے میں آیا ہے۔ اور علمی سوشلزم کو جو مزدور تحریک کا نظریاتی اظہار ہے اس کام کے لیے تاریخی حالات پیدا کرنے ہیں اور اس کی نوعیت متعین کرنی ہے اور اس طرح مزدور طبقے کو اس کام کے حالات اور اس کی نوعیت سے آگاہ کرنا ہے تاکہ وہ اپنا تاریخی فرض ادا کر سکے۔

ہماری کتابیں

لینن ازم کی اساس	..	استالن	۴ؕعہ/
دیہات کے غریبوں سے خطاب	..	لینن	عہ/
فاشزم کیا ہے ؟	..	مولفہ شہاب الدین	۱۲/
جاپان کا اصلی روپ	..	مولفہ صادق حسن	۴ؕسہ/
نیا روس	..	مولفہ سبط حسن	۱۰/
کارل مارکس سوانح	..	مولفہ شرف عالم	۱۲/
لینن "	..	استالن	۶/
استالن "	..	مولفہ منظر رضوی	۶/
ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کا دستور اساسی			۳/
اتحاد و عمل کا پیام (کمیونسٹ پارٹی کی سیاسی تجویز)			۶/
ہل اور ہنیا (کسانوں کے مسائل اور ان کا حل)			۶/
مزدور طبقے کے وطنی فرائض	..		۸/
نئے نغمے (ترقی پسند شاعروں کی نظمیں)			۶/
نفرت (روسی افسانہ)	..	تنلوخات	۶/
زویا (بہادر روسی لڑکی کی سرگذشت)		مولفہ علی سردار جعفری	۳/
جھنکار (نظموں کا مجموعہ)	..	کیفی اعظمی	۴ؕعہ/
پیکار (ڈرامہ)	..	علی سردار جعفری	۶/

زیرِ طبع کتابیں

۱	مارکسزم اور قومیت	اسٹالین
۲	کارل مارکس کی تعلیمات	لینن
۳	کارل مارکس اور ہندستان	مارکس
	بالشویک پارٹی کی تاریخ	ادارہ ماسکو
۵	سویت روس کی عورتیں	رضیہ ظہیر

قومی دار الاشاعت بمبئی ۴

راج بھون، سینڈھرسٹ روڈ

شرف اطہر علی نے مہر نگار پریس ٹمکر اسٹریٹ بمبئی نمبر ۳ سے چھپوا کر قومی دار الاشاعت، راج بھون سینڈھرسٹ روڈ بمبئی ۴ سے شائع کیا

طبقے کی سیاسی حکمرانی، تعلیم و تہذیب کی اجارہ داری نہ صرف غیر ضروری اور فضول ہو جائے بلکہ اس سے معاشی، اور سیاسی اور علمی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہونے لگیں۔

اب یہ وقت آگیا ہے۔ خود سرمایہ داروں کو بھی اب اپنے سیاسی دیوالیہ پن اور ذہنی کھوکھلے پن کا احساس ہو گیا ہے اور ان کا معاشی دیوالہ تو ہر دسویں سال پابندی کے ساتھ نکلتا رہتا ہے ہر معاشی بحران کے زمانے میں سماج خود اپنے ہی پیدا آور عناصر اور پیداوار کے بوجھ سے دب جاتی ہے۔ وہ ان سے کام نہیں لے سکتی۔ اور بے بسی کی حالت میں کھڑی اس مہمل تضاد کا نظارہ دیکھتی رہتی ہے کہ پیدا کرنے والوں کے پاس صرف کرنے کو کچھ نہیں کیونکہ صرف کرنے والا کوئی نہیں! ذرائع پیداوار کی پھیلتی اور بڑھتی ہوئی قوت ان زنجیروں کو توڑ پھینکتی ہے جو سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار نے اسے پہنا رکھی ہے۔ پیدا آور قوتوں کی مسلسل اور مستقل آور، روز بروز تیز ہونے والی ترقی اور پیداوار کی لامحدود افزائش کی واحد شرط یہ ہے کہ پیدا آور قوتوں کو ان بیڑیوں سے چھٹکارا ملے۔ لیکن ان بیڑیوں کے ٹوٹنے کے اثرات یہیں تک محدود نہیں ہیں۔ ذرائع پیداوار پر سماج کا قبضہ ہو جانے کے بعد نہ صرف پیداوار کی موجودہ بناوٹی پابندیاں دور ہو جائیں گی بلکہ پیدا وار آور اور پیدا آور قوتیں ضائع ہونے سے بھی بچ جائیں گی۔

(بسلسلہ صفحہ ۱۱۰) کا مکمل انسداد اور ایک بے طبقہ سماج کا قیام قرار دیا تھا۔ اس کام کو ایک نہایت شدید طبقاتی جدوجہد کے ذریعہ ہی پورا کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے ریاست یعنی مزدور طبقے کی آمریت کو برقرار رکھنے ہی کی نہیں، بلکہ مزید تقویت پہنچانے اور ترقی دینے کی ضرورت ہے۔

"ہم ریاست کے تدریجی زوال کے حق میں ہیں۔ پھر بھی ہم مزدور طبقے کی آمریت کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں جو اب تک تمام قسم کی ریاستوں میں سب سے زیادہ طاقتور اور زبردست ہے۔ ہمارا مدعا یہ ہے کہ ریاست کے تدریجی زوال کے حالات پیدا کرنے کے لئے ریاست کی طاقت کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے۔ کیا یہ 'متضاد' ہے؟ ہاں۔ اس میں ایک تضاد ہے لیکن یہ تضاد ایک زندہ حقیقت ہے اور (مارکسی) جدلیات کا پورا پورا عکس ہے۔"

(لینن ازم۔ از۔ اسٹالین۔ جلد دوئم صفحہ ۳۵۲)

جو ان دنوں، خاص کر بحران کے زمانے میں، پیداوار کا یہی حشر ہوا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ سماج کا قبضہ ہو جانے کے بعد آج کل کے حاکم طبقوں اور ان کے سیاسی نمایندوں کی دیوانہ وار فضول خرچیوں اور عیاشیوں کا بھی خاتمہ ہو جائے گا اور اس طرح پیداوار اور ذرائع پیداوار کا ایک بڑا حصہ سماج کے قبضے میں آجائے گا۔ اب پہلی بار اس بات کا امکان پیدا ہوا ہے کہ اجتماعی پیداوار کی بدولت سماج کا ہر فرد ایسی زندگی بسر کرے کہ نہ صرف اس کی مادی ضرورتیں اچھی طرح پوری ہوتی ہوں، بلکہ ایسا ماحول بھی پیدا ہو جس میں ہر آدمی اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو پوری آزادی کے ساتھ ترقی دے سکے اور کام میں لا سکے۔[حاشیہ]

ذرائع پیداوار پر سماج کا قبضہ ہوتے ہی جنس تبادلہ کا پیدا ہونا بند ہو جائے گا۔ اور اس کے ساتھ دولت پیدا کرنے والے پر پیداوار کا تسلط بھی ختم ہو جائے گا۔ سماجی پیداوار کی

حاشیہ سرمایہ داری کے بوجھ سے دبے ہونے پر بھی جدید ذرائع پیداوار میں ترقی کرنے کی کتنی زبردست صلاحیت ہے، اس کا اندازہ چند اعداد و شمار سے ہو جائے گا۔ گیفن کے تازہ ترین تخمینہ کے مطابق برطانیہ اور آئرلینڈ کی پوری دولت

۱۸۱۴ء	میں	ڈو ارب بیس کرور پونڈ تھی
۱۸۶۵ء	میں	چھ ارب دس کرور پونڈ تھی
۱۸۷۵ء	میں	آٹھ ارب پچاس کرور پونڈ تھی

بحران میں ذرائع پیداوار اور پیداوار کس قدر برباد ہوتے ہیں اس کا اندازہ کچھ اس سے ہو سکتا ہے کہ دوسری جرمن صنعتی کانگریس (منعقدہ برلن، مورخہ ۲۱ فروری ۱۸۷۸ء) کے تخمینہ کے مطابق پچھلے بحران میں جرمنی کو صرف لوہے کی صنعت میں چوالیس کرور پچاس لاکھ مارک یعنی دو کرور تائیس لاکھ پچاس ہزار پونڈ کا نقصان ہوا تھا۔ (نوٹ از اینگلس)

سامراجیت یعنی سرمایہ داری کی آخری اور بلند ترین منزل میں پیداآور قوتوں کی مزید ترقی کے بارے میں لینن لکھتا ہے۔ "اجارے، ایک مختصر سے گروہ کی حکومت، آزادی کے بجائے فرماں روائی (باقی صفحہ ۱۱۳ پر)

طوائف الملوکی بھی دور ہو جائے گی ۔ اس کے بدلے پوری ہوشمندی اور تدبیر کے ساتھ پیداوار کی تنظیم کی جائے گی ۔ اپنی اپنی بقا کے لئے افراد کی باہمی کش مکش ختم ہو جائے گی اور ایک اعتبار سے انسان دوسرے حیوانات سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کرے گا اور زندگی کی درندگیوں سے چھٹکارا پا کر حقیقی معنی میں انسانی زندگی میں قدم رکھے گا ۔ انسانی زندگی کا وہ ماحول جس نے اب تک انسان پر حکومت کی اب انسان کے ماتحت ہو جائے گا ۔ انسان پہلی بار اشرف المخلوقات بنے گا ۔ وہ قدرت پر فرمانروائی کرنے لگے گا کیونکہ اپنی سماجی تنظیم پر اب اس کی فرمانروائی قائم ہو چکی ہوگی ۔ انسانی سماج کے وہ قانون جو اب تک انسان پر اس طرح حکومت کرتے تھے گویا وہ

(بسلسلہ صفحہ ۱۱۴) کی کوشش، گنتی کے چند نہایت دولت مند اور طاقتور قوموں کے ہاتھوں چھوٹی یا کمزور اقوام کی کثیر اور روز افزوں تعداد کا لوٹا جانا، انہی سے سامراجیت کی وہ مخصوص صفات پیدا ہوتی ہیں جن کی بدولت ہم اسے دوسروں کے بل پر جینے والی یا جاں بلب سرمایہ داری کہتے ہیں ۔ سامراجیت کا ایک رجحان روز بروز زیادہ نمایاں ہوتا جا رہا ہے اور وہ ہے سماجی یا سود خور ریاست کا ظہور جس میں سرمایہ دار طبقہ، سرمایہ برآمد کر کے اس کی آمدنی پر اور سٹہ بازی کے ذریعے زندگی بسر کرتا ہے لیکن زوال کے اس رجحان سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ سرمایہ داری کی ترقی کے امکانات ختم ہو چکے ۔ ایسا نہیں ہے ۔ سامراجیت کے عہد میں، بعض صنعتوں میں سرمایہ داروں کی بعض جماعتوں میں اور بعض ملکوں میں ان دونوں (یعنی زوال یا تیز ترقی کے رجحانوں) میں سے کوئی نہ کوئی رجحان کسی حد تک ضرور پایا جاتا ہے ۔ بحیثیت مجموعی سرمایہ داری پہلے سے کہیں زیادہ تیزی سے ترقی کر رہی ہے ۔ لیکن اولاً تو یہ ترقی روز بروز زیادہ ناہموار ہوتی جا رہی ہے ۔ اور پھر یہی نہیں ۔ یہ ناہمواری خاص طور پر یوں ظاہر ہوتی ہے کہ جو ملک سرمایہ کے اعتبار سے سب سے دولت مند ہیں (جیسے انگلستان) ان کا زوال ہونے لگتا ہے ۔"

(از منتخبات لینن ۔ پانچویں جلد ۔ سامراجیت ۔ سرمایہ داری کی آخری منزل ۔ صفحہ ۱۱۶-۱۱۵)

قدرت کے قانون بھی انسان کے تابع ہو جائیں گے۔ انسان ان سے اچھی طرح سمجھ بوجھ کر کام لیا کرے گا۔ انسان کی اپنی سماجی تنظیم (جو اب تک اس کی حریف بنی رہی گویا وہ قدرت یا تاریخ کے کسی ان مانے فرمان کا نتیجہ تھی) اب انسانوں کے اپنے رضاکارانہ عمل کا نتیجہ ہو گی۔ وہ حقیقی، خارجی قوتیں جو اب تک تاریخ پر حاوی رہی ہیں، اب خود انسان کی اطاعت کرنے لگیں گی۔ اسی وقت سے انسان جان بوجھ کر اور اپنے ارادے کے تحت آپ اپنی تاریخ بنائے گا۔ اسی وقت سے انسان خود سماجی قوتوں سے کام لینے لگے گا اور ان قوتوں کے نتائج بھی روز بروز بڑی حد تک اس کی خواہش کے مطابق ہوتے جائیں گے۔ یہ ہو گی انسانیت کی جست، احتیاج سے اختیار کی طرف!

ارتقا کے ان مدارج کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ ازمنۂ وسطیٰ کا سماج ـــــ چھوٹے پیمانے پر انفرادی پیداوار۔ آلہ جات پیداوار آدمیوں کے انفرادی استعمال کے مطابق ہوا کرتے تھے اس لئے بہت بھدے، چھوٹے اور ہلکے پھلکے ہوتے تھے۔ پیدا کرنے والا خود اپنے یا اپنے جاگیردار آقا کے فوری استعمال کے لئے چیزیں پیدا کرتا تھا۔ اگر کبھی پیداوار صرف (استعمال) سے زائد ہوتی تو یہ زائد حصہ بازار میں بیچنے کے لئے لایا جاتا۔ جنس تبادلہ کی پیداوار بھی اپنی ابتدائی منزل میں تھی۔ لیکن سماجی پیداوار کی طوائف الملوکی کے جراثیم اس کے اندر موجود تھے۔

۲۔ سرمایہ دار انقلاب ـــــ ابتدائی میل جول اور کارخانہ داری کی بدولت صنعت میں تبدیلی ہونے لگتی ہے۔ ذرائع پیداوار، جو اب تک بکھرے ہوئے تھے، بڑے بڑے کارخانوں میں یکجا ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انفرادی ذرائع پیداوار کے بجائے اجتماعی ذرائع پیداوار بن جاتے ہیں۔ اس تغیر کا بحیثیت مجموعی طریقۂ تبادلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ملکیت کی پرانی صورتیں بدستور قائم رہتی ہیں۔ سرمایہ دار کا ظہور ہوتا ہے۔ وہ ذرائع پیداوار کا مالک ہے، اس لئے پیداوار پر بھی قبضہ کر لیتا ہے اور انھیں جنس تبادلہ بنا دیتا ہے۔ پیداوار ایک اجتماعی عمل کی حیثیت اختیار کر چکی ہے لیکن تبادلہ کرنے اور تصرف میں لانے کے افعال اب تک انفرادی ہیں

یعنی انھیں الگ الگ افراد انجام دیتے ہیں۔ اجتماعی پیداوار پر انفرادی سرمایہ دار قبضہ کر لیتے ہیں۔ یہی بنیادی تضاد ہے جس سے وہ تمام دوسرے تضاد پیدا ہوتے ہیں جن کے حلقے میں موجودہ سماج گردش کرتا ہے اور جن کے خدوخال کو جدید صنعت نے بہت روشن اور نمایاں کر دیا ہے۔

(ا) پیدا کرنے والا ذرائع پیداوار سے الگ ہو جاتا ہے۔ مزدور تمام عمر اُجرت پر کام کرنے پر مجبور ہے۔ مزدور طبقے اور سرمایہ دار طبقے کی دشمنی۔

(ب) اُن قوانین کا اثر بڑھتا ہے جو جنس کی پیداوار پر حاوی ہوتے ہیں۔ بے عنان مسابقت کا دور شروع ہوتا ہے۔ کارخانوں کی اجتماعی تنظیم اور پیداوار کی بحیثیت مجموعی طوائف الملوکی میں تضاد۔

(ج) ایک طرف مسابقت کی وجہ سے مشینوں کو بہتر بنانا انفرادی کارخانہ داروں کے لئے ایک جبری قانون بن جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ مزدوروں کی ایک بڑھتی ہوئی تعداد کام سے الگ کی جاتی ہے۔ یہ صنعت کی محفوظ فوج ہے۔ دوسری طرف پیداوار کی غیر محدود توسیع بھی ہر کارخانہ دار کے لئے مسابقت کا ایک جبری قانون ہے۔ ہر طرف پیداآور قوتوں کی غیر معمولی ترقی جو کبھی کسی نے سُنی نہ ہو، طلب سے زیادہ رسد۔ فاضل پیداوار۔ بازار کا چیزوں سے بھر جانا۔ ہر دسویں سال معاشی بحران۔ ایک ابدی چکر، ایک طرف ذرائع پیداوار اور پیداوار کی افراط ہے۔ دوسری طرف مزدوروں کی افراط ہے جن کا نہ کوئی سلسلہ روزگار ہے اور نہ جن کے پاس کوئی رزق کا سامان ہے۔ لیکن یہ دونوں عناصر جو پیداوار اور سماجی بہتری میں اضافہ کر سکتے تھے، یکجا ہو کر کام نہیں کر سکتے۔ کیونکہ سرمایہ دار طریقۂ پیداوار پیداآور قوتوں کو کام کرنے سے روکتی ہے اور پیداوار کو گردش میں نہیں آنے دیتی جب تک وہ پہلے سرمایہ نہ بن جائے۔ لیکن پیداوار کی افراط کی حالت میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ تضاد بڑھ کر لغزیت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ طریقۂ پیداوار طرزِ تبادلہ کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اب سرمایہ دار طبقہ خود اپنی پیداآور قوتوں کا انتظام کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

(د) خود سرمایہ داروں کو مجبور ہو کر پیداآور قوتوں کی اجتماعی نوعیت کو کسی حد تک تسلیم کرنا کرنا پڑتا ہے۔ پیداوار اور نقل وحمل کے بڑے بڑے ادارے پہلے مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں اور پھر ٹرسٹوں اور آخر میں ریاست کے سپرد کر دئے جاتے ہیں۔ یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ سرمایہ دار طبقہ ایک عضوِ معطل ہے۔ اس کے تمام سماجی فریضے اب اس کے تنخواہ دار ملازم انجام دیا کرتے ہیں۔

۳۔ مزدور انقلاب ــــ تضاد کا حل: مزدور طبقہ ریاستی اقتدار پر قبضہ کر لیتا ہے۔ اور اس اقتدار کی مدد سے اجتماعی ذرائع پیداوار کو جو سرمایہ داروں کے ہاتھ سے کھسکتے جا رہے تھے پنچائتی ملکیت قرار دیتا ہے۔ ایسا کر کے مزدور طبقے نے ذرائع پیداوار کو سرمایہ کی خصوصیات سے جن کا وہ اب تک حامل تھا، آزاد کر دیا۔ وہ ذرائع پیداوار کی اجتماعی نوعیت کو پروان چڑھنے کا پورا موقع دیتا ہے۔ اب اجتماعی پیداوار کسی باقاعدہ لائحہ عمل کے مطابق ہوتی ہے۔ پیداوار کے ترقی کرنے کی وجہ سے سماج میں مختلف طبقوں کا وجود اب بے جوڑ ہو جاتا ہے۔ جیسے جیسے سماجی پیداوار کی طوائف الملوکی دور ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے ریاست کا سیاسی اقتدار بھی ختم ہوتا جاتا ہے۔ اور انسان بالآخر اپنی سماجی تنظیم کا مالک بنتا ہے اور اسی کے ساتھ قدرت پر بھی اس کی فرماں روائی قائم ہو جاتی ہے۔ وہ آپ اپنا مالک یعنی آزاد ہو جاتا ہے۔

دنیا کو آزاد کرانے کا تاریخی کام جدید مزدور طبقے کے حصے میں آیا ہے۔ اور علمی سوشلزم کو جو مزدور تحریک کا نظریاتی اظہار ہے اس کام کے لئے تاریخی حالات پیدا کرتے ہیں اور اس کی نوعیت متعین کرتی ہے اور اس طرح مزدور طبقے کو اس کام کے حالات اور اس کی نوعیت سے آگاہ کرنا ہے تاکہ وہ اپنا تاریخی فرض ادا کر سکے۔

ہماری کتابیں

لینن ازم کی اساس	..	استالن ..	عہ/
دیہات کے غریبوں سے خطاب	..	لینن	عہ/
فاشزم کیا ہے ؟	..	مولفہ شہاب الدین	۱۲/
جاپان کا اصلی روپ	..	مولفہ صادق حسن	عہ/
نیا روس	..	مولفہ سبط حسن	۱۰/
کارل مارکس	سوانح ..	مولفہ شرف عالم	۱۲/
لینن	" ..	استالن	۶/
استالن	" ..	مولفہ منظر رضوی	۶/
ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کا دستور اساسی			۳/
اتحاد و عمل کا پیام	(کمیونسٹ پارٹی کی سیاسی تجویز)		۶/
ہل اور ہنسیا	(کسانوں کے مسائل اور ان کا حل)		۶/
مزدور طبقے کے وطنی فرائض	..		۸/
نئے نغمے	(ترقی پسند شاعروں کی نظمیں)		۶/
نفرت	(روسی افسانہ) ..	شلوخاف	۶/
زویا	(بہادر روسی لڑکی کی سرگزشت)	مولفہ علی سردار جعفری	۳/
جھنکار	(نظموں کا مجموعہ) ..	کیفی اعظمی	عہ/
کسان	(ڈرامہ) ..	علی سردار جعفری	۶/

زیر طبع کتابیں

۱	مارکسزم اور قومیت	ا ستا[illegible]
۲	کارل مارکس کی تعلیمات	[illegible]سن
۳	کارل مارکس اور ہندستان	مارکس
	بالشویک پارٹی کی تاریخ	ادارہ ماسکو
۵	سوویت روس کی عورتیں	رضیہ ظہیر

قومی دار الاشاعت بمبئی ۴

راج بھون۔ سینڈھرسٹ روڈ

شرف اطہر علی نے مہر نگار پریس ٹیکما اسٹریٹ بمبئی نمبر ۳ سے چھپوا کر قومی دار الاشاعت، راج بھون سینڈھرسٹ روڈ بمبئی ۴ سے شائ[illegible]